حدیثِ خودی
جگر بریلوی

نہ مرنے ہی دیا تم نے نہ جینے ہی دیا تم نے
ہوئی ہے خاص صورت سے مرتب داستاں میری

حدیثِ خودی

خود نوشت سوانح حیات

جگر بریلوی

ادبستانِ اردو، امرتسر

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

بارِ اوّل

تاریخ اشاعت	اگست ۱۹۵۹ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	دو روپے

ادبستانِ اردو امرتسر

فہرست

مقدمہ	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۵
حصّہ اوّل		
باب اوّل	خاندان	۳۵
باب دوم	ولادت اور تعلیم و تربیت	۴۷
باب سوم	شاعری کی بدایت و نہایت	۶۲
باب چہارم	غیر معمولی باتیں	۸۶
باب پنجم	تصنیفات	۹۰
حصّہ دوم		
میری غزل		۹۵

جگر اہلِ بصیرت دل میں دیتے ہیں جگہ اس کو
بظاہر داستانِ دردِ غم ہے داستاں میری

مقدمہ

ایک زمانہ تھا کہ صاحبِ کمال اور اہلِ قلم نام ونمود کی خواہش اور ستائش کی تمنا کو حقیر سمجھتے تھے۔ بڑے بڑے سخن ور طلبِ جاہ سے بے نیاز رہ کر خاموشی کی زندگی بسر کرتے اور عزلت نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی شانِ استغنا سے ان کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ صاحبِ اقتدار ان کے آستانے پر جبہ سائی کو فخر جانتے تھے اور عوام ان کا کلام ایک شہر سے دوسرے شہر میں تحفے کے طور پر لے جاتے تھے۔ لیکن اب وہ شب ورز کہاں! سائنس اور مشینی ترقی کی بدولت زندگی میں انقلاب آگیا ہے۔ دلچسپیاں اور سرگرمیاں کئی گُنا بڑھ گئی ہیں۔ سکون عنقا ہے۔ تفریح کے نئے نئے وسائل کی رنگا رنگی قدم قدم پر دامن کھینچتی ہے۔ اب نہ پہلے سی فراغت ہے نہ شعروادب کی وہ اہمیت! اب زمانہ خاموشی اور بے نیازی کا نہیں، مسلسل جد وجہد کا ہے۔ مشینی برق رفتاری کے اس دور میں اقلیم سخن کے حاشیہ بردار تو کیا، تاجدار بھی خود ستائی اور خود نمائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور شہرت پسندی کی کوششوں سے دامن نہیں بچاسکتے ایسے

حالات میں اگر کسی شخص کی افتادِ طبع یہ ہو:

در کارِ ماست نالہ و ما در ہوائے او
پروانۂ چراغِ مزارِ خودیم ما

اور وہ شخص غیرت اور علوئے نفس کے سہارے ساری عمر اپنی ہی کھال میں مست رہا ہو تو اس کا قبولِ عام کے رتبے تک نہ پہنچنا اور نسبتاً غیر معروف رہنا تعجب خیز نہیں، کیونکہ:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

شام موہن لال جگر بریلوی کی شخصیت فطرت اور ماحول کی انھیں نیرنگیوں کا دلچسپ مرقع ہے۔ ان کی عمر ستر برس سے کچھ اوپر ہوگی۔ زمانے کے سرد و گرم کو جس طرح انھوں نے چکھا ہے، کم لوگوں کو تجربہ ہوگا۔ "حدیثِ خودی" ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے "دیدۂ عبرت نگاہ" کا تقاضا کرتی ہے۔

اردو ادب میں سوانح عمری کی روایت نئی نہیں۔ لیکن اس کا جدید تصور مغرب کی دین ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے ادب میں سوانح کے اجزاء، تزک، تذکرے، تاریخ اور سیر کی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد یہاں تاریخ سے دلچسپی کا جو رجحان پیدا ہوا، اس کی وجہ سے مشاہیر کے حالات محفوظ کرنے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ ایسی تصانیف عموماً تین قسم کی ہوتی تھیں۔ سب سے زیادہ توجہ مذہبی اکابر پر صرف کی جاتی تھی اور ان کے ملفوظات و حالات سے متعلق کتابیں مرتب کی جاتی تھیں۔ مثلاً دہ مجلس، گلزار فریدی (وقائع حضرت بابا فرید گنج شکر از پیر محمد حسین چشتی)

احسن الاقوال (ملفوظات شیخ برہان الدین غریب از خواجہ عماد بن حماد کاشانی) خیر المجالس (ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی) اخبار الاخیار (شیخ عبد الحق محدث دہلوی) جوامع الکلم (ملفوظات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) سیر محمدی (مولانا شاہ محمد علی) بجتہ الاسرار (حالات و ملفوظات شیخ عبد القادر جیلانی از نور الدین ابو الحسن علی بن یوسف) انوار العیون (ملفوظات و حالات شیخ احمد عبد الحق از شیخ عبد القدوس گنگوہی) وغیرہ وغیرہ۔ ملفوظات کے علاوہ اس زمانے میں بعض ایسے تذکرے بھی لکھے جاتے تھے جو اولیاے کرام اور صوفیا و مشائخ کے سوانح پر مشتمل ہوتے تھے مثلاً تذکرۃ الاولیا (خواجہ فرید الدین عطار) سفینۃ اولیا (دارا شکوہ) تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء (سید محمد حسین) تذکرہ المعین فی ذکر الکاملین (زین العابدین) محبوب ذی المنن تذکرہ اولیاے دکن (عبد الجبار خاں) ہفت بہشت (سوانح عمری خواجگان چشت از قربان علی بسمل) وغیرہ۔

دوسرے درجے پر بادشاہوں کے روزنامچے یا خود نوشت یادداشتیں لکھی جاتی تھیں جیسے تزک بابری، ہمایوں نامہ، آئین اکبری (ابو الفضل) تزک جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری (میرزا احمد عرف معتمد خاں بخشی) وقائع عالمگیر اور ماثر عالمگیری (محمد ساقی مستعد خاں)

ادبی سوانح عمریاں فارسی میں بہت کم ہیں اور اردو میں بھی ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ لے دے کے شیخ علی حزیں اور اس کے بعد خدائے سخن میر تقی میر کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اس زمانے میں سوانح عمری چونکہ مستقل صنف ادب کے لحاظ سے کوئی الگ حیثیت نہیں رکھتی تھی اس لئے قدیم تصانیف میں شخصیت اور سیرت کے سارے نقوش پوری طرح اجاگر نہیں ہوتے تھے ملفوظات میں عموماً پیری مریدی کا احساس غالب رہتا تھا اور عقیدت کی چاندنی میں

ہر شے نورانی معلوم ہوتی تھی۔ روزنامچوں میں نظر واقعات کی رفتار پر رہتی تھی۔ بیچ کے حالات کا راز نہیں کھلتا تھا۔ سیر کی کتابوں میں سیرت کا مبالغہ آمیز نقش پیش کیا جاتا۔ لیکن حالاتِ زندگی مختصر اور تشنہ رہتے تھے۔ تذکروں میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یعنی ان میں حالات تو کسی حد تک تھے لیکن سیرت نگاری کی خوبیاں مفقود تھیں۔ جدید سوانح عمری ان سب کوتاہیوں کا جواب ہے۔ مغربی ادب کے مطالعہ کے اثر سے پہلی بار اردو والوں کو اس ڈھنگ سے سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا جس میں ذاتی عقیدت و احترام سے ہٹ کر، سیرت کی خوبیوں اور خامیوں کو تحقیقی مواد کی روشنی میں پرکھا جائے اور شخصیت کی صحیح تصویر مربوط طریقے سے ادبی طور پر پیش کی جائے۔ اس کام کی ابتدا شبلی اور حالی نے کی۔

شبلی اور حالی کے زمانے میں ملکی حکومت، شخصی موروثی یا جاگیرداری جو کبھی تھی، دم توڑ چکی تھی اور تصوّف کی گرم بازاری بھی نہ رہی تھی۔ اس لئے سوانح و تاریخ کے میدان میں نگاہیں زیادہ تر ماضی کے سرمایہ پر پڑیں۔ اور مذہبی سوانح عمریوں کی ایک نئی قسم وجود میں آئی، جو قدیم خامیوں سے یکسر پاک تو نہ تھیں لیکن جدید دَور کے بعض تقاضوں کو ضرور پورا کرتی تھیں مثلاً شبلی کی المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی۔ اولاد حیدر فوق بلگرامی کی "اسوۃ الرسول"۔ اور سراج المبین فی تاریخ امیر المومنین۔ سوانح احمدی (محمد جعفر تھانیسری) سیرۃ الصدیق (محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی) سیرت سید احمد شہید۔ (ابوالحسن علی) تذکرہ شاہ ولی اللہ اور سوانح قاسمی (مناظر احسن گیلانی) محمودیہ (عبید اللہ سندھی) حیات شیخ الہند (مولانا محمد حسن از سید اصغر حسین)

حیات عبدالحق محدث دہلوی (خلیق احمد نظامی) صدیق اکبر (سعید احمد اکبر آبادی) سید احمد شہید (غلام رسول مہر) وغیرہ

جدید دور میں مذہبی سوانح کے ساتھ ساتھ ادبی سوانح کی بھی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آئی۔ حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کے بعد حیات النذیر، تذکرہ از ابوالکلام آزاد۔ حیاتِ خسرو (محمد حبیب) حیاتِ خسرو (سعید احمد مارہروی) حیاتِ حافظ (محمد اسلم جے راج پوری) امیر خسرو (وحید مرزا) حیاتِ انیس، حیاتِ دبیر، حیاتِ رشید، حیاتِ اکبر، حیاتِ محمد قلی، حیاتِ مومن، حیاتِ شبلی (سید سلیمان ندوی) شبلی نامہ (محمد اکرام) رند پارسا وغیرہ لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ سودا، میر، غالب، حالی، داغ، آزاد، اقبال وغیرہ سے متعلق جو متعدد تنقیدی و تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں ان کے سوانحی حصے میں بھی سوانح نگاری کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہ دور ہندوستان میں ذہن کی بیداری اور غیر ملکی سامراج کے خلاف جد وجہد کا تھا۔ اس لئے بعض سماجی اور سیاسی سوانح عمریاں بھی مرتب ہوئیں۔ سماجی سوانح عمریوں کے لئے حیاتِ جاوید (حالی) حیاتِ سرسید (نورالرحمن) حیاتِ محسن، حیاتِ وقار (محمد امین زبیری) نمونے کی چیز ہیں۔ سیاسی سوانح عمریوں میں سے بیشتر اردو میں ترجمے کے ذریعے آئیں۔ جیسے گیری بالڈی، میزینی، نپولین، کمال اتاترک، لینن، چیمبرلین، اسٹالن اور دوسرے غیر ملکی قومی مشاہیر کی سوانح کے اردو ترجمے۔ مہاتما گاندھی کی معرکتہ الآرا سوانح عمری "تلاشِ حق" اور ان کی اور جواہر لال نہرو کی سوانحی اہمیت کی مختلف کتابیں اردو میں ترجمے کے ذریعے لی گئیں۔ خود اردو کی خاص خاص سیاسی سوانح عمریاں

یہ ہیں :

حیاتِ ولی (سوانح ولی اللہ دہلوی از محمد رحیم بخش) محمد علی (عبدالماجد دریاآبادی) حیاتِ اجمل، جمال الدین افغانی اور آثار ابوالکلام آزاد (قاضی عبدالغفار) مولینا محمد علی (خواجہ احمد عباس) محمد علی جناح (رئیس احمد جعفری) حیات قائد اعظم (سردار محمد خاں) حیات ڈاکٹر سیف الدین کچلو (شریف احمد) آزاد کی کہانی (ملیح آبادی)

اردو سوانح عمری کے ارتقا کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ اردو میں خود نوشت سوانح عمریوں کی کمی ہے۔ کسی اردو سخن ور کے قلم سے نکلی ہوئی پہلی خود نوشت سوانح میر تقی میر کی "ذکرِ میر" ہے۔ لیکن یہ فارسی میں ہے۔ سید حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح عمری "نقشِ حیات" نیم مذہبی اور نیم سیاسی کارنامہ ہے۔ عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" ان کی ہمہ گیر صحافتی زندگی کی داستان ہے۔ سید رضا علی کی تصنیف "اعمال نامہ" اور تقی محمد خاں خورجوی کی "عمر رفتہ" (ساقی سالنامہ ۵۸ء) خوب ہیں لیکن ان دونوں کے مصنف فقط ان سوانح عمریوں کی حد تک اردو ادیب ہیں، اس لئے تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت زیادہ نہیں۔ البتہ عبدالغفور نساخ کی سوانح عمری قابلِ ذکر ہے لیکن وہ ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی (ملاحظہ ہو نگار اپریل ۵۹ء) اس لحاظ سے جگر بریلوی کی "حدیثِ خودی" کسی اردو شاعر کی اردو میں لکھی ہوئی پہلی مطبوعہ خود نوشت سوانح عمری ہے۔

تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ حدیثِ خودی کا ادبی تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

سوانح لکھنا دراصل اتنا آسان فن نہیں جتنا وہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں تاریخ کی طرح دیے گئے مواد کو ترتیب دینا ہی کافی نہیں۔ نہ یہاں تخلیقی ادب کی طرح ہر شے تخیلی ہوتی ہے۔ بلکہ سوانح میں ان دونوں کا جوہر ہوتا ہے یعنی دیے گئے تحقیقی مواد کی تہذیب و ترتیب ایسے ادبی انداز پر کرنا پڑتی ہے کہ اس میں تخلیق کی شان پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ دشوار گزار ہے۔ اس سلسلے میں سوانح نگار کی مشکلات اور بھی بڑھ جاتی ہیں جب اپنی ہی شخصیت کا مرقع پیش کرنا ہو۔

آپ بیتی سے متعلق اہم ترین بات نقطۂ نظر کی ہے۔ اگر مصنف کا نقطۂ نظر معروضی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اپنی شخصیت کا تجزیہ خود کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اور ضروری نہیں کہ ہر صاحبِ قلم اس پر قادر ہو۔ جانسن کا قول ہے کہ اچھی سوانح عمری وہ نہیں جو فرد کی عظمت کا راگ گائے بلکہ خوشی کی تلاش میں انسان کے سفر کی نشان دہی کرے۔ بڑی بات زندگی کی کامیابیاں گنوانا یا انھیں بڑھا چڑھا کر بیان کرنا نہیں بلکہ کامیابیوں اور ناکامیوں کے بنیادی رشتے کا سراغ لگاتے ہوئے اپنی کمزوریوں کی اصلیت سے پردہ اٹھانا ہے۔ عرفی کیا خوب کہہ گیا ہے:

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمیں خویش

یہ نظر اپنے سے بلند ہو کر ہی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن بعض اوقات طبیعت کی کجی نقطۂ نظر میں بے تعلقی پیدا نہیں ہونے دیتی اور غلط باتوں کی غلط تاویل سے غیر صحت مند نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس عملِ جراحی کے سلسلے میں ذوقِ سلیم یا طبیعت کی سلامت روی بھی رہنما بن سکتی ہے مگر ان پر ہمیشہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر نظر میں گہرائی نہیں تو ذوقِ

سلیم بھی شخصیت کے ناگوار پہلوؤں پر پردہ ڈال جائے گا یا اُنھیں گوارا بنا کر پیش کرے گا۔ وہ اس کوشش میں بھی رہے گا کہ شخصیت کو مثالی نمونہ بنا کر پیش کرے جو اصلیت کے برعکس ہوگا اور سوانح نگار خود ستائی یا خود نمائی کے جُرم کا مرتکب ہوگا۔ جگر بریلوی کو سوانح نگاری کے ان خطرات کا گہرا احساس ہے۔ اس لئے کہیں کہیں ان کی زبان سے ایسے جملے نکل گئے ہیں: "اُن تذکرے کو یا ایسی ہی اور باتوں کو، جو کہیں کہیں زبانِ قلم پر آجائیں، تعلّی یا رجز خوانی پر محمول کرنا میرے حق میں ظلم ہوگا۔ شاعر ہوں، مگر تصنع شیوہ نہیں۔ ہاں بظاہر ان باتوں کو تحریر میں لانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اپنے حالات سپردِ قلم کر رہا ہوں امورِ واقعی کو چھپا دینا بھی دیانتِ سوانح نگاری کے خلاف ہے۔"

لیکن سوانح نگاری کے لئے دیانت کے علاوہ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ وہ ہے انتخابِ مواد۔ اس کے بغیر سوانح واقعات کی کھتونی بن کر رہ جاتی ہے۔ انتخاب مواد میں ذرا سی بے پروائی سے سارا نقشہ بگڑ سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سوانح نگار نے اپنے دل کو پا لیا ہو اور زندگی میں اپنے مرکز کی پہچان رکھتا ہو۔ تبھی وہ واقعات کی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے ان میں ایسا فنکارانہ ربطِ باہمی قائم رکھ سکے گا کہ ایک تجربے سے دوسرے تجربے تک شخصیت کے بنیادی اجزا صاف نظر آنے لگیں۔

بعض اوقات شخصیت کی بنیادی خصوصیت ایک چھوٹے سے واقعہ یا ماحول کی ذرا سی فیاضی یا معمولی سی کمی کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ جگر بریلوی کی سوانح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی کا مکمل بے تعلقی سے جائزہ لیتے ہوئے اپنے بچپن کے بعض ایسے واقعات

بھی پوست کندہ بیان کر دیے ہیں جو بظاہر غیر اہم معلوم ہوتے ہیں مگر جن کا تعلق
ان کی سیرت کے اساسی اجزا سے گہرا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر
جگر بریلوی کی کم آمیزی، خلوت پسندی اور غم آشنائی کا سراغ ان کے بچپن
کے ماحول میں ملتا ہے۔

اپنے والد کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے مزاج میں
رکھ رکھاؤ اور نفاست اس درجہ تھی کہ اپنے ملنے والوں سے بھی ایک
خاص حد تک تعلقات رکھتے تھے۔ وہ بچوں کے معاملے میں بڑے محتاط
اور متشدد واقع ہوئے تھے۔ "بچوں کے اوضاع واطوار اور ادب و
آداب کی نگرانی ہر وقت ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ مکان کے پھاٹک کے
باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ حد یہ تھی کہ اپنے کنبے والوں کے یہاں
بھی بیاہ برات یا کسی بھی تقریب میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے۔ پندرہ
سولہ برس کی عمر تک میں نے یہ نہیں جانا کہ ریل کا سفر کیسا ہوتا ہے۔"
اس کڑی نگہداشت سے بچے بُری صحبت سے تو دُور رہے لیکن اُس
رس جس سے محروم ہو گئے جو شخصیت کی بھرپور نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔
بچے جو فطرتاً چڑیوں کے چہچہوں کی طرح آزاد ہوتے ہیں، گھر کی چہار دیواری
میں مقید ہو کے رہ گئے۔ اُن کے کھیل کود اور ہنسی خوشی کا دائرہ سکڑ گیا۔
اس نہایت سخت پرداخت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جگر بریلوی بچپن کی اُن نعمتوں سے
محروم رہے جو نئے نئے ہم جولیوں کی دوستی یا دشمنی کے ذریعے زندگی کی
وسعتوں سے روشناس کراتی ہیں، دل کی زمین کو نئے جذبات اور احساسات
کے لئے تیار کرتی ہیں اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کے امکانات
پیش کرتی ہیں۔ وہ گھر سے باہر میلے ٹھیلوں اور کھیل تماشوں میں بھی بہت

کم شریک ہوئے۔ کیونکہ والدین ایسی سیر و تفریح کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تھے۔ غرض انھیں بچپن ہی میں فراغت اور بے فکری کی جنت کے بجائے اپنے داخلی خول کی گھٹن نصیب ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ ان کی حاس طبیعت اس ذہنی قید کے خلاف بغاوت کر دیتی لیکن دس ہی برس کے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا، تمناؤں اور خواہشوں کے رہے سہے سوت بھی ہمیشہ کے لئے سوکھ گئے۔ اس کے بعد جہاں زبان کو چپ لگ گئی اور کم آمیزی طبیعت کا حصہ بن گئی، وہاں دل کی کلی مرجھانے لگی اور باطنی کیفیت یہ تھی کہ ع

مرا نہ ہمدمی خود ملال می آید

اسی زمانے میں ایک عارف کے زیرِ اثر آئے اور اس کی تربیت کے فیضان سے طبیعت کے غیر دنیوی میلان کو معقولیت کا جواز مل گیا۔ فارسی ادب کے مطالعے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ والد بات بات پر نصیحت کرتے تھے:

نشۂ عشق بپیمانۂ آزاد دہند
ہر شگافِ دلِ خود را درِ میخانہ شمر

غرض رفتہ رفتہ خوشی کے تمام رنگ پھیکے نظر آنے لگے۔ خود لکھتے ہیں:

"ہوش کی نشو و نما کے ساتھ افسردگی کو اپنی طبیعت میں ودیعت پایا۔ ایک پراسرار غم کا بوجھ دل کو دبانے لگا۔ بارہ چودہ سال کی عمر سے یہ بات محسوس ہوئی۔ مغموم رہتا تھا۔ بلا کسی ظاہر اسبب کے اکثر بے اختیار منھ سے آہ نکل جاتی تھی۔ ماحول دل شکن اور یاس انگیز نظر آنے لگا۔ جب کبھی خوش رنگ نئے کپڑے پہنتا، عام لڑکوں کی طرح بجائے خوش ہونے کے اداس ہو جاتا۔ یہ جامہ زیبی کچھ ہیچ سی نظر آتی تھی۔ نمود و نمائش کا

احساس بھی تکلیف دیتا تھا جیسے مجھ پر کوئی ہنستا ہو۔ دل سے پژمردگی کا بوجھ کبھی نہ ہٹا"۔

خاندانی وجاہت اور وقار، جس کا انھیں شروع سے گہرا احساس دلایا گیا تھا، ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا۔ خاندانی جھگڑوں اور تنازعوں سے نہ صرف جائداد ٹھکانے لگ گئی بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مخالفین نے ان کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کرا دیا۔

یہ ابھی طالب علم تھے۔ پولیس اسکول سے پکڑ لائی اور گرفتاری دل کے داغوں میں ایک اور مستقل داغ کا اضافہ کر گئی جس سے ملنے والوں سے دور دور رہنے اور جاننے والوں کی آنکھیں بچانے کا طبیعت کو ایک اور موقع ملا۔ تعلیم ختم ہوئی تو بیکاری سوہانِ روح ہو گئی۔ اس وقت تک شادی ہو گئی تھی اور ایک بچی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ اس پر گھر کا ادبار! ایسے مرحلے پر انسان یا تو فرار کی راہ اختیار کرتا ہے یا ماحول سے نبرد آزما ہو کر اس سے مطابقت کی کوشش کرتا ہے۔ فرار کی راہ خودکشی، گمراہی، مے خواری وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے، ماحول سے نبرد آزمائی کے لیے ذہنی صلاحیتوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ انھوں نے اگر ساتھ نہ دیا تو دیوانگی کا طلسمات زیادہ دور نہیں رہتا اور نہ سخت واقعہ کی تاب لانے کے لئے "جانِ عزیز" کی تہذیب ہونے لگتی ہے اور غم، ماحول سے مطابقت کی کوشش میں اپنے اظہار کی نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ بابے جگر بریلوی کو اپنے آبا و اجداد سے فکرِ سخن کا مادہ ودیعت ہوا تھا[۱]

---

[۱] ان کے والد رائے کنہیا لال قدر بلگرامی شاگرد غالب سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور دل تخلص تھا۔ نانا منشی گنگا پرشاد بھی فارسی کے عالم اور اردو کے شاعر تھے۔ اوج تخلص کرتے تھے اور آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔

وہ آڑے وقت کام آیا اور غم کی تہذیب میں اس سے حیرت انگیز مدد ملی۔ ان کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد غم کے رنگ میں نئے عنوان سے جو شدت پیدا ہوئی اسی شدت میں دفعتہً شاعری نے جنم لیا۔ بقولِ صائب:

زبیماری بہاں تیمار دارے میشود پیدا

شعر گوئی کی کیفیت شروع میں مستقل نہیں تھی لیکن مصائب اور آلام کی یورش اس کے بعد بھی جاری رہی، چنانچہ جگر رفتہ رفتہ اس "دود چراغ" کے ثریا کی قدیم" بن گئے۔ شعر و سخن نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا جو میر نے کہا تھا:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

بڑی کوششوں سے ملازمت حاصل ہوئی۔ توقع تھی کہ اس کے ذریعے کسی بڑے عہدے تک ترقی ہوگی اور خاندانی وجاہت اور وقار کو بحال کر سکیں گے۔ لکھتے ہیں: "یہ خواب بڑا انشاط انگیز تھا۔ لیکن یہاں بھی ٹھوکر پہ ٹھوکر لگی اور تمناؤں کا خون ہوتا گیا"۔

جس نہج پر تعلیم ہوئی تھی اور مزاج کی جو اُفتاد تھی، وہ شرائط ملازمت کی متحمل نہ ہو سکی۔ کہاں سرکاری نوکری کی بندشیں اور کہاں اُن کی فطری آزادروی اور باطنی تقاضے! نائب تحصیلداری سے سلسلہ شروع ہوا۔ اور اسی پر ختم ہوگیا۔ زندگی دُکھ درد کی دلدوز داستان بن گئی۔ انھیں کا شعر ہے:

رستخیزِ غم بقیدِ ہوش ہے
زندگی اک محشرِ خاموش ہے

جیسے جیسے زندگی میں کامیابی کی اُمید مٹتی گئی۔ طبیعت زیادہ سے

زیادہ خاموش ہوتی گئی اور وہ اس حد تک کم آمیز، کم گو اور کم اختلاط بن گئے کہ "کوئی ملنے آتا ہے تو رسمی دعا سلام کے بعد سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا بات چیت چھیڑوں"۔ یہی اپنے خول میں بند رہنے کی عادت دراصل کامیابی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ان کا بیان ہے کہ "اپنے حقوق کے مطالبے میں سعی و سفارش تو کجا، اظہارِ مطلب سے بھی عار رہا"۔ معاشی پریشانیوں اور باطنی کشمکش نے صحت تباہ کر دی۔ وقت سے بہت پہلے پنشن لینے پر مجبور ہوئے۔ سات کم عمر بچوں کا بوجھ اور خانہ داری کی بھاری ذمہ داریاں سر پر تھیں۔ جوں توں یہ وقت بھی کٹا، لڑکا جوان ہو کر ملازم ہوا۔ آسودگی اور راحت کی صورت بندھی ہی تھی کہ سب سے ہونہار لڑکے کی اچانک موت نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا:

اے وائے ز محرومیِ دیدار دگر ہیچ

ایک رمق، خوشی کی جو اُمید باقی تھی، اس حادثے کے بعد وہ بھی نہ رہی اور زندگی حزن و ملال کی نہ ختم ہونے والی رات بن گئی۔ رنج اور ناامیدیِ جاوید کے اس عالم میں جی ہلکا کرنے کا اگر کوئی راستہ تھا تو غزل! غرض ان کی زندگی غزل میں اور غزل ان کی زندگی میں ڈھلتی رہی۔ ان کی شاعری کے بارے میں یہ حقیقت ہے:

سینچا ہے جس کو خونِ جگر سے وہ باغ ہے

یہ وہ خاص خاص موڑ ہیں، جن کے پیچ و خم سے جگرؔ بریلوی کی سیرت کا نقش اُٹھا ہے اور جن کا جاننا، اُن کا کلام سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے انھوں نے اپنے حالات "حدیثِ خودی" میں ہر قسم کی جذباتیت سے بلند ہو کر معروضی انداز میں لکھے ہیں اور انھیں ربط و اختصار سے ایسی

خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے کہیں بھی اپنی خامیوں کو خوبیاں اور خوبیوں کو اعجاز ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اچھے سوانح نگار کا ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ مرکزی کردار کی کمزوریوں کا اعتراف کر کے پڑھنے والوں کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے اور اسے قائم رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے جگر بریلوی نے بھی پوری احتیاط اور فنی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے اور پڑھنے والے کی ہمدردیاں شروع سے آخر تک ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ البتہ جہاں اُنھوں نے اپنے والد بزرگوار کے کلام پر روشنی ڈالی ہے، اپنا قلم چند لمحوں کے لئے عقیدت کے ہاتھ میں دیدیا ہے۔

اچھی سوانح عمری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک شخص کو مرکز بنا کر زندگی کے وسیع تر خاکے سے روشناس کراتی ہے۔ وہ صرف شخص کی داستان نہیں ہوتی بلکہ اس میں روحِ عصر کی تصویر بھی جھلکتی ہے۔ اچھا سوانح نگار انفرادی حالات کے ساتھ ساتھ سماجی رفتار کی نبض پر بھی ہاتھ رکھتا ہے ورنہ سماجی کش مکش کو پوری طرح سمجھے بغیر شخصیت کے ارتقا کا صحیح ادراک نہیں ہو سکتا۔ گردوپیش کے سماجی حالات کا جیسا شعور "ذکرِ میر" میں ملتا ہے، اردو فارسی کی کسی دوسری سوانح عمری میں نہیں پایا جاتا۔ لیکن تاریخی حالات کے ذکر میں "زلفِ یار کی سی درازی" ہی ذکرِ میر کی خامی ہے۔ جس کی وجہ سے خود میر کے حالات تشنہ رہ گئے ہیں۔ حدیثِ خودی میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں شخصی حالات تو بقدرِ ضرورت ہیں لیکن گردشِ دوراں کی چاپ صاف سُنائی نہیں دیتی۔ ایسا غالباً اختصار کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں سماجی اور سیاسی حالات کا

ذکر آگیا ہے، اس بات کا مقتضی ہے کہ:

ز چشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

خصوصاً جہاں انھوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی داستان بیان کی ہے۔ انگریز افسروں کی خودسری اور مطلق العنانی۔ مقامی ملازموں کی بے بسی اور بے چارگی۔ رشوت کی گرم بازاری، ہندوستانیوں کی آپس کی پھوٹ، منافقت، خود غرضی اور مقدمہ بازی۔ ان سب کا ذکر انھوں نے بین السطور میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ نہ تھا جب ہندوستان میں قومی جدوجہد کی لہر اٹھ رہی تھی۔ جگر صاحب اپنے فطری مزاج اور وسائل کی کمی کی بنا پر اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ تو نہ لے سکے، لیکن انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سرکاری ملازم جو خیر خواہیاں دکھا رہے تھے، وہ ان سے دور رہے۔ انھوں نے ایک حبہ چندہ جمع کرنے کی کوشش کی نہ ایک پیسہ خود دیا۔ اور نہ کبھی کوئی رنگروٹ فراہم کیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تہ دار شخصیتیں بعض ایسے خصائص رکھتی ہیں، جنھیں عام تجربات کی روشنی میں سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس معاملے میں سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ان خصائص کو عمومیت کا رنگ دے کر اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے لئے ناقابل فہم نہ رہیں۔ جگر بریلوی کی شخصیت کا یہ پہلو دلچسپی سے خالی نہیں کہ انھیں سترہ اٹھارہ برس کی عمر سے پُراسرار تجربات سے واسطہ رہا۔ مثلاً "خوابوں کا سچا ہونا، اشعار کے ذریعے پیشین گوئیاں ہونا، غیبی آوازوں سے آئندہ کے واقعات کی آگاہی ہو جانا زندگی کا کوئی اہم واقعہ ایسا نہیں جس کا علم کسی نہ کسی ذریعے سے پہلے نہ ہو گیا ہو۔ دوسری طرف نفسیاتی کیفیتوں کی کارفرمائی بھی کم حیرت انگیز نہیں رہی

جو خواہش دل میں پیدا ہوئی اس کے برعکس ظہور میں آیا۔" ان کے متعلقاتِ شاعری کا یہ انوکھا پہلو ہے کہ اشعار کے ذریعے آنے والے واقعات کی اطلاع سی ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیل انھوں نے اپنی ایک انگریزی تصنیف میں پیش کی ہے۔ حدیثِ خودی میں جو چند ایک سرسری مثالیں دی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے شروع دسمبر ۱۹۴۲ء میں یہ شعر ہوا:

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے وہ رنگ ہے آج
جیسے جاتا ہو چھڑائے ہوئے داماں کوئی

اس کے چند روز بعد نوجوان بیٹے کی میت یہی شعر پڑھتے ہوئے اٹھانا پڑی اسی زمانے میں ایک اور شعر ہوا:

سینے میں آگ دہکتی ہے، لب پیاس سے سوکھے جاتے ہیں
جو قطرے چُلّو بھر بھی نہیں، ان سے لے شبنم کیا ہوگا

جگر بریلوی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے، "اس آگ سے مراد بے چینیاں تھیں جن میں میری زندگی ناقی (جوانا مرگ فرزند) کی رحلت کے بعد گزری۔ پیاس سے مراد وہ شدید حاجتیں جو اہل و عیال کی پرورش کے باعث روز و شب لاحق رہ کر جان ضیق میں ڈالے رہیں۔ چلّو بھر قطروں سے وہ چند گلٹی کے سکے، جن پر معاش منحصر ہوئی۔"

انسانی فطرت کی نیرنگیاں اور کرشمہ سازیاں عجیب و غریب ہیں۔ ایسے لوگوں کے سچے واقعات موجود ہیں جو کمرے میں بند چیزوں کی ماہیت بتا دیتے ہیں، کتاب کھولے بغیر اس کے پڑھنے پر قادر ہو سکتے ہیں، بغیر ہپناٹائز کئے دل کے راز عیاں کر دیتے ہیں یا زمین کے نیچے دفن ہو کر کئی روز تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ راقم الحروف کو خود ایک ایسے شخص سے

ملاقات کا اتفاق ہوا جسے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کے پیچیدہ سے پیچیدہ اور طویل سے طویل ہندسے دئے جاتے تھے لیکن وہ چند ہی سیکنڈ میں بغیر فکر و تامل کے ان کا بالکل صحیح جواب لکھ دیتا تھا۔ نیاز فتح پوری صاحب نے بھی پچھلے برس "نگار" میں ہوڈینی اور کمبرلینڈ کے چند خارق عادات واقعات بیان کئے ہیں۔ کمبرلینڈ عموماً اپنے دوستوں کے پوشیدہ سوالات کا نہایت صحیح جواب دیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار آسٹریا کے ولی عہد نے ایسے سیاہ کتے کا تصور کیا جس کا علم خود اس کو بھی نہ تھا۔ لیکن کمبرلینڈ نے اس کا صحیح مقام و پتہ بتادیا۔ اسی طرح وزیر گلیڈسٹون نے بھی کمبرلینڈ کو آزمایا اور اس کی صلاحیت کی تصدیق کی۔ غرض یہ بات کہ فطرت بعض لوگوں کو دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کرتی ہے، ناقابلِ یقین نہیں۔ جگر صاحب کے بارے میں بھی اتنی بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ ان کی فطری افتاد نے ان کی غم پرور صلاحیتوں کو اس قدر پختہ کردیا ہے کہ ان کے قلب و روح آنے والے آلام و مصائب سے چند روز پہلے ہی متاثر ہوجاتے ہیں۔

حدیث خودی کے دوسرے حصے میں جگر بریلوی نے اپنی شاعری اور خصوصاً غزل پر مختصراً تبصرہ کیا ہے۔ ایک آدھ صفحے میں اپنی تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ان کی خدمات کیسی وسیع اور اہم ہیں۔ جگر صاحب کی خلقی خاموشی اور بے نیازی کی وجہ سے ان کے ادبی کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔ اگر ان کی خدمات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنی کم نویسی کے باوجود کیا بلحاظ کیفیت و کیا باعتبار کمیت، انھوں نے نظم و نثر کے میدان میں اچھے اچھے جغادریوں کو پیچھے چھوڑا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے دو تذکرے

"یادِ رفتگاں" اور "بہارِ جاوداں" دقّتِ نظر اور تحقیقی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ "جدید تغزّل" اور "منشی نوبت رائے نظر کی حیات اور شاعری" پر ان کی مبسوط تصانیف ہنوز طبع نہیں ہوئیں۔ فن اور زبان پر انھیں جو عبور ہے، وہ "صحتِ زبانِ اردو" اور "اسناد" جیسی کتابوں سے ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ادبی اور علمی مضامین رسالہ زمانہ، نیرنگِ نظر، ہمایوں اور نگار میں برسوں شائع ہوتے رہے ہیں۔

شاعری میں سوائے ان کی معرکتہ الآرا مثنوی "پیامِ ساوتری" اور چند نظموں کے ایک چھوٹے سے مجموعے "رنگ و بو" کے ہنوز کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ غزلوں کا مجموعہ "راز و نیاز" نظموں کا "نور و سرور" رباعیات کا "اسرار" اور بچوں کی نظموں کا مجموعہ "کلیاں" ابھی پبلشروں کے طاقِ نسیاں کا گلدستہ بنے ہوئے ہیں۔ البتہ ان کی غزلوں کا انتخاب انجمن ترقی اردو عنقریب شائع کرنے والی ہے۔

ان کی شعرگوئی کا یہ پہلو قابلِ توجہ ہے کہ وہ شاعری برائے شعر گفتن نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ اکثر جذبات کی شدت میں کوئی مصرعہ زبان پر آگیا۔ اسے شعر کر لیا اور دل کی کیفیت ادا ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غزلوں میں متضاد کیفیات ملتی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی حالت میں لکھی نہیں گئیں۔ انھوں نے کبھی رواجاً اور رسماً شعر کہا، نہ اس ارادے سے غزل لکھی کہ دیوان مرتب کرنا ہے۔ جب طبیعت حاضر ہوئی تو کہہ لیا، ورنہ دماغ پر زور نہیں ڈالا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی فرمائشیں پوری کرسکے نہ مشاعروں کے شاعر بن سکے۔

اپنی شاعری پر خود تبصرہ کرنا بڑا نازک کام ہے۔ ذرا سی لغزش

سے مصنف، خودستائی اور خود نمائی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جگر بریلوی نے اس ذمہ داری کا ذکر کرتے ہوئے چند لفظوں کی مدد سے اپنی راہ کے کانٹے یوں نکالے ہیں:

"کسی کے کلام میں دو باتیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ کیا کہا ہے اور کس انداز سے کہا گیا ہے۔ دونوں نہایت وسیع بحث کی طالب ہیں۔ میں صرف پہلی بات کو لیتا ہوں یعنی میں نے کیا کہا۔ دوسری بات ایک جملے میں ختم ہے اگر انداز میں اثر ہے تو سب کچھ ہے۔ اس اثر کا اندازہ دوسرے لوگ کر سکتے ہیں۔ شاعر کو تو اپنا کلام اچھا ہی لگتا ہے۔"

آگے چل کر انھوں نے حسن اور غم کو اپنی شاعری کے بنیادی اجزا قرار دیا ہے۔ حسن سے متعلق ان کا کہنا ہے۔ "زندگی میں سب سے پہلی چیز جس کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے، حسن ہے۔ بچپنے سے حسین مناظر، دلکش تصاویر، نغمہ و سرود میری روح میں نشاط سے ایک ہیجان پیدا کر دیتے تھے۔ حسن شعلہ بن کر جان میں اترتا تھا۔ برسات کے موسم میں حسن کی جلوہ سامانیاں بے پناہ ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بالکل دل کو مسوس ڈالے گا۔ یا وہ جھلس کر رہ جائے گا۔

یہ درصل مظاہر فطرت کی دلکشی اور دیدہ زیبی کے کرشمے تھے حسنِ انسانی کی تجلی تو شباب کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد کوندنا شروع ہوتی ہے۔ لیکن جگر بریلوی کو بچپن ہی سے وضع احتیاط اور" آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری" میں آہستہ سانس لینے کی جو عادت پڑ گئی تھی، وہ شعر کی دنیا میں بھی ساتھ رہی اور انھوں نے حسن و عاشق کے معقول جذبات و احساسات کا کھل کر اظہار کرنا ہمیشہ معیوب سمجھا۔ پھر غمِ روزگار کے ہاتھوں بھی اتنی فراغت

اور فرصت نصیب نہ ہوئی کہ عشق کے ارضی تصور کی کشش محسوس کرتے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور ترجمانی کرتے ۔ اس لحاظ سے ان کا محبوب بہت کچھ اصغر کے غیر مرئی محبوب سے ملتا جلتا ہے ۔ کہتے ہیں:

بالیدگیِ روح ہے یا جلوۂ نگار
پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لئے ہوئے

یہ محبوب کا وہ تصور ہے، جس کی تعبیر سے خواہ حواس آشنا نہ ہوں لیکن اس کی تصویر سے جمالیاتی سطح پر ذوق و وجدان ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ محبوب کے اس غیر جسمانی تصور کی بدولت جگر کی غزل عشق و عاشقی کی رنگینی اور دلچسپی سے محروم ہو گئی ہے ۔ لیکن فلسفۂ حیات کے رموز و نکات بیان کرنے کے اسے وسیع مواقع ہاتھ آئے ہیں ۔ جگر کے ہاں جذبات کی بے ہنگم فراوانی نہیں ۔ جذبہ ان کے ہاں عقل و شعور سے روشنی لے کر شعر کے قالب میں ڈھلتا ہے ۔ متین، سنجیدہ اور سلجھے ہوئے لب و لہجے میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا پختہ کارانہ تجزیہ ! ان کا مخصوص رنگِ سخن ہے ۔ ان کی غزل کا انداز عاشقانہ نہیں، حکیمانہ ہے ۔

جگر بریلوی کے فلسفۂ حیات میں بنیادی حیثیت غم کی ہے ۔ اس میں شاید ہی کسی کو کلام ہو کہ زندگی کی حقیقت خوشی نہیں، غم ہے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ خوشی دراصل کوئی کیفیت ہی نہیں بلکہ غم کی عارضی غیر موجودگی کا نام ہے جسے کوئی استحکام نہیں ۔ جیسے رات کی تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن ایک لمحے کے لئے چمک جائے اور بس ! جگر بریلوی کو زندگی میں جیسے "روزِ سیاہ" سے سابقہ رہا ہے اور انھیں پے بہ پے آلام کے جو بے ستون کاٹنے پڑے ہیں، ان کا تقاضا یہی رہا ہے کہ زندگی مکمل طور پر غم سے

عبارت سمجھی جائے۔ اس پر جگر کی خلوت پسندی اور کم آمیزی مستزاد غرض غم ہمیشہ کے لئے ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

غم سے نبرد آزمائی کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنی شکست قبول نہ کرنے اور تڑپ تڑپ کر جیے جانے والا میر کا انداز ہے ؎

سر مارنا پتھر سے اور ٹکڑے جگر کرنا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

اس انداز میں جب مزاج کی شوخی اور نفسیاتی گہرائی شامل ہو جاتی ہے تو غالب کی طرح دل کے داغوں سے کھیلا جا سکتا ہے ـــــ اور "دلِ محیط گریہ و لب آشنائے خندہ" کے مصداق زندگی بسر ہوتی ہے۔ دوسرا انداز منہ بسورنے اور رو رو کر غم سہنے کا ہے۔ اس میں انسان خود بھی کڑھتا ہے اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ فانی کے ہاں غم کی یہی کیفیت کمال خلوصِ فن سے جلوہ گر ہے۔ غم سے نبرد آزمائی کا ایک تیسرا انداز بھی ہے۔ یہ نہ اندر ہی اندر گھلنے کا ہے، نہ اپنے زخموں پر لب آسا مسکرانے کا! یہ انداز فاتحانہ تیوروں سے غم کی اصلیت جھٹلاتا ہے نہ اپنی بے چارگی جتاتے ہوئے غم کی اہمیت بڑھاتا ہے، بلکہ ان دونوں کے بین بین غم کو غم سمجھتے ہوئے اس کے متوازن اظہار سے جی کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ یہی جگر بریلوی کا خاص انداز ہے۔ غم ان کے نزدیک چونکہ زندگی کی بنیادی حقیقت ہے، اس لئے منفی نہیں بلکہ ایک مثبت قدر ہے۔ ہماری تمام نفسیاتی کیفیتوں میں فقط غم ایک ایسی کیفیت ہے جس سے دل اور دماغ شدت سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ یہ خوبی محبت میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن محبت کے نشاط انگیز پہلو میں اثر پیدا کرنے والی

قوت عموماً سطحی اور عارضی ہوتی ہے۔ محبت کا اثر گہرا اور دائمی تبھی ہوتا ہے جب اس میں "درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو" کے غم انگیز عناصر شامل ہو جائیں۔ یہ سعادت غم ہی کو حاصل ہے کہ اس سے جسم و روح بیک وقت شدید طور پر متاثر ہوتے ہیں اور دل پر ایسی رقت طاری ہوتی ہے کہ انسانی طبیعت سے خود غرضی، تعصب، تنگ نظری، نفرت، غصہ فریب دہی وغیرہ جملہ انسانی عیوب کا گرد و غبار ہٹایا جا سکے۔ غم کے اثر سے دل کی زمین نرم ہو جاتی ہے اور دردمندی و شرافتِ نفس کے ایسے خودرو پودے سر اٹھاتے ہیں جن پر خلوص، اخوت، محبت، حق پرستی وغیرہ متعدد صفاتِ حسنہ کے پھول کھلتے ہیں۔ جگر بریلوی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "غم نے جس میں ساری عمر تڑپتے گزری، کبھی کبھی اس جھلک سے بھی ہم کنار کر دیا، جس کا حظ و انبساط اور کیف و سرور بیان سے باہر ہے۔" وہ غم کو KATHARSIS یعنی تہذیبِ نفس کا بہترین وسیلہ سمجھتے ہیں۔ انھیں کا شعر ہے:

حسرتیں مٹتی رہیں، دل پے بہ پے ٹوٹا کیا
ایک تہذیبِ مسلسل زندگی کا نام تھا

اسی تہذیبِ مسلسل کا نتیجہ ہے کہ جگر بریلوی گناہ و ثواب میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کا بیان ہے۔ "میں اس معصیت کا قایل ہوں، جو بنی نوعِ انسان کے باہمی رشتے پر حرف لائے۔ انسانیت کے دامن پر داغ ہوں۔ ہر انسان کو اپنے ماں باپ، اپنی سماج اور قوم کا کچھ فرض ادا کرنا ہے۔ سنسار ایک بہت بڑا کنبہ ہے جس میں ہر مرد عورت کے کچھ فرائض ہیں۔ کچھ حقوق ہیں۔ انھیں ادا نہ کرنا اور ان سے غافل رہنا معصیت ہے۔"

ان کا ایمان ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے، مقدرات سے ہے۔ پے بہ پے آلام و مصائب اور غور و فکر کی عادت نے انھیں بھی اسی عالم گیر حقیقت تک پہنچایا ہے کہ " مجبوروں پہ مختاری کی تہمت " ناحق ہے۔ ان کا شعر ہے:

زندگی اپنی، نہ موت اپنی نہ دل اپنا نہ دماغ
کون کہتا ہے کہ مختار ہوں، مجبور نہیں

اسی لئے وہ عمل اور مکافاتِ عمل کے بھی قائل نہیں:

مزاجِ حسن کا اک عالمِ تلون ہے
کچھ اور اس کے سوا رمزِ کائنات نہیں

لیکن جبر و تقدیر کا قائل ہونے کے باوجود وہ عمل اور سعی و تدبیر کو بے معنی نہیں سمجھتے۔ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا آئینِ فطرت کے خلاف ہے۔ "ہاتھ پاؤں کام کرنے کے لیے، دل احساس اور دماغ سوچنے کے لئے ہے۔ اگر یہ سب معطل ہو جائیں تو آثارِ زندگی ہی مٹ جائیں۔ مقتضیاتِ فطرت کیونکر پورے ہوں۔ اس لئے تدبیر و عمل ناگزیر ہے اور انسان فعل و عمل سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ مقصود صرف یہ ہے:

رفتار فرض ہے تو قدم کیوں غلط پڑیں
ہر چند ہم اسیرِ زماں و مکاں سہی

جس سے کھل جائے فریبِ حسن و تدبیر و عمل
ایسی بھی اک کوششِ ناکام ہونا چاہیے[۴]

یہ ہیں جگر بریلوی کے فلسفۂ حیات کے بنیادی عناصر، جن کے ذکر و اذکار نے ان کی سوانح کو اصحابِ نظر کے لئے مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔

اچھی سوانح عمری میں دوسری بنیادی خوبیوں کے ساتھ ادبی شان کا ہونا بھی شرط ہے۔ سوانح عمری شخصیت کا کیسا ہی مربوط اور گہرا تجزیہ کیوں نہ پیش کرتی ہو اور روحِ عصر کی کتنی سچی ترجمانی کیوں نہ کرتی ہو اگر اس میں ادبی رنگ نہیں تو وہ تاریخی دستاویز ہو تو ہو، سوانح عمری نہیں کہی جا سکتی۔ جگر بریلوی نے اس کا پورا خیال رکھا ہے۔ حدیثِ خودی کی ایک خوبی اس کا متوازن، معتدل اور مختصر اندازِ بیان ہے۔ کل چھ جزو کی کتاب میں انھوں نے اپنے ستر برس کے گوناگوں تجربات، زندگی کے نشیب و فراز اور شعر و شاعری سے متعلق نظریاتی مسائل کو ایسی خوبی سے سمویا ہے گویا:

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

ساری کتاب میں ایک لفظ غیر ضروری یا زائد نہیں۔ سیدھا صاف اندازِ بیان، جس میں دلکش محاورے کہیں کہیں لطف دے جاتے ہیں۔ فقرے مربُوط ہیں، جیسے کوئی بالمشافہ گفتگو کر رہا ہو۔ کہیں گنجلک یا ژولیدہ بیانی نہیں۔ پھر الفاظ کا انتخاب ایسا مناسب اور معقول کہ بات دل میں اُتر جائے اور کہنے والا بھی خود نمائی کے خطروں سے صاف دامن بچا جائے۔ جو کچھ لکھا ہے، جذباتیت سے ہٹ کر لکھا ہے۔ بے ہنگم عبارت آرائی نام کو نہیں جو بات کہنا چاہی ہے، سوچ سمجھ کر کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ صاف کہی ہے۔ کہیں کہیں برجستہ اشعار سے نثر چمک گئی ہے اشعار عموماً اپنے پیش کئے ہیں ورنہ نثر کی معنویت بڑھانے کے لئے اساتذہ کے اشعار کو بھی بڑی خوبی سے کھپایا ہے۔ پوری کتاب میں کہیں جھول محسوس نہیں ہوتا۔ ایک ایک جملہ طبیعت حاضر کر کے اور جی ٹھونک کے لکھا ہے۔ جہاں سے کھول کر دیکھئے معلوم ہوگا:

آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں

کہیں کہیں دلچسپ ادبی نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر مشاعروں سے متعلق انھوں نے اپنا جو مسلک ظاہر کیا ہے، اس سے ہمارے موجودہ شاعر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ "اب تک چھ سات مشاعروں میں شرکت کی نوبت آئی ہوگی، وہ بھی کسی مجبوری سے۔ خواہ مخواہ کی واہ واہ اور سبحان اللہ کو میں شاعری کا حاصل یا شاعر کا صلہ یا اس کے کلام کی تنقید نہیں سمجھتا۔ شعر و سخن میں ایک روحانی لذت ہے۔ جس کے آگے دنیا کی تمام لذتیں ہیچ ہیں۔ یہی لذت شاعرانہ زندگی کا حاصل ہے۔ ہنگامہ آرائی سے اور اس سے کیا واسطہ!"

ایک اور مقام پر اُنھوں نے نقّادوں کی بھی خبر لی ہے۔ جدید تنقید میں نفسیاتی، تاثراتی اور مارکسی نظریوں کی جو افراط و تفریط ہے۔ جگر بریلوی نے ان میں سے کسی کا نام لے کر اس کی مذمت نہیں کی لیکن ناقدوں کی اس روش کا ماتم ضرور کیا ہے جو انھیں بنیادی ادبی اقدار کی صحیح پرکھ سے دُور رکھتی ہے۔ کہتے ہیں۔ "تمام اشعار دل کے ترجمان نہیں ہوتے۔ بہت سے عقل و شعور کے بھی منت گزار ہوتے ہیں۔ دل سے جو نکلتے ہیں، اِن میں اور اُن میں اکثر تباین و تضاد نظر آتا ہے۔ ان میں سے کس کو شاعر کی روح کا مظہر سمجھا جائے۔ اسے سمجھنے کے لئے شاعر کے کردار پر گہری نظر ڈالنا پڑتی ہے۔ اشعار و کردار دونوں سے اس کی شخصیت تک، شخصیت سے باطن تک اور باطن سے نہاں خانہ روح تک بخوبی رسائی ہو جاتی ہے۔ . . . نقاد کا کام یہ ہے کہ روح اور اس کے مظاہر میں یکرنگی تلاش کرکے صحیح صحیح اور پورے

خط و خال اس تصویر کے نمایاں کر دے، جس کا نام شاعر ہے۔۔۔۔۔ شاعر
کے مکمل پیکر کا اندازہ لگانے کے لیے بڑی وسیع اور عمیق اور صحیح نظر کی
ضرورت ہے۔ اس کی طبیعت کی چگونگی، کیفیتوں کی نزاکت، تصورات و
تاثرات کی گوناگونی تک پہنچنے کے لئے جتنا وسیع اس کی ذات کا علم ہوگا۔
اتنا ہی اس کے شعر کا مفہوم حقیقی ہوگا اور اس سے شاعر کی تصویر صاف
اور بے لاگ نظر آئے گی۔ یہ بھی یاد رہے کہ شاعر عام فطرت لے کر
نہیں آتا۔ جو لوگ شاعر کی زندگی پر نظر ڈالے بغیر اسے محض رسمی اور رواجی
واقعات اور کیفیات کا مجموعہ سمجھ کر اس کے شعر کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ
جو نقشہ پیش کرتے ہیں، ناقص ہوتا ہے اور اس سے ایک مکمل وجود کا
ایک ہی رخ سامنے آتا ہے۔ حیات کو سمجھے بغیر غلط فہمیاں ہونا لازمی
ہیں۔ یہ غلط فہمیاں شاعر کو مجروح کر دیتی ہیں۔ ناقدوں پر خنجر زنی کا
الزام عاید کرتی ہیں۔ اس جرم میں وہ بھی گرفتار ہیں، جو بے جا ستائش
کرتے ہیں اور وہ بھی جو خردہ گیری پر اتر آتے ہیں"

ایسے بیانات سے جگر بریلوی کا نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آتا
ہے۔ انھوں نے "حدیثِ خودی" لکھ کر یقیناً ہمارے لئے بہت سی باتیں محفوظ
کر دی ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ادب و اخلاق کا درس دینا ہے نہ اپنی
عظمت جتانا ہے۔ وہ کارڈینل نیومان کی (Apologia pro sua vita)
کی طرح اپنے اعمال کی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں نہ SELMA LAGERLÖF
کی طرح MARBÄCKA لکھ کر پرانی یادوں کے سہارے جینے کے خواہاں
ہیں۔ ہیلن کیلر کی طرح انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی اس لئے بیان
نہیں کئے کہ ان کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو۔ نہ ہی انھیں اپنے اشہبِ قلم

کی جولانیاں دکھانا مقصود ہے۔ بلکہ اس خود نوشت سے جگّو بریلوی کا مدعا محض اپنی شخصیت کے اساسی عناصر کو معروضی طور پر پیش کرنا ہو تاکہ ان کے کلام کے بنیادی محرکات سمجھنے میں مدد ملے۔ بلاشبہ وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ سوانح عمری اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس سے اردو کی ایک ایسی ادبی صنف میں اضافہ ہوا ہے جو ہنوز اپنی نشو و نما کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو داں طبقہ اس کے مطالعہ سے پوری طرح لطف اندوز ہوگا ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غم میں گزری کہ یا خوشی میں گزری
تاریکیِ شب کہ چاندنی میں گزری

حصّہ اوّل

حالاتِ زندگی

ہزار رنگ کے دل سے رہے ہیں راز و نیاز
کہیں کہیں سے سناتا ہوں داستاں اپنی

(جگرؔ بریلوی)

باب اول

خاندان :- سر لیتھ برج کی تاریخ گولڈن بک[1] آف انڈیا میں تحریر ہے کہ میرے آباؤ اجداد قنوج سے بریلی آئے تھے۔ دوسری کتب تاریخ سے اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب راجا نول رائے والئ قنوج کے حکمراں پر وہاں کے پٹھانوں نے چڑھائی کی اور وہ مارا گیا تو ان با اقتدار اور صاحب اثر کائستھ گھرانوں پر بھی نزلہ گرا جو راجا کے قرابت دار سمجھے گئے۔ حکومت ان کی بیخ کنی پر تل گئی۔ اسی زد میں میرے خاندان کے بزرگ بھی آئے۔ انہوں[2] نے پرانے چھتری راجپوتوں کی طرح جوہر کیا۔ اپنی بہو بیٹیوں کو قتل کر ڈالا اور حکومت کا مقابلہ کیا۔ ادھر چند نفر کی جماعت، ادھر ایک منظم فوج، ہاتھی اور مینڈھے کا مقابلہ تھا۔ مارے گئے۔ جن کی جانیں سلامت رہ گئیں وطن عزیز کو خیر باد کہکر ادھر اُدھر نکل گئے۔ کچھ کسی مقام پر پہنچے کچھ کسی خطے میں، جس کے جہاں سینگ سمائے وہیں کا ہو رہا۔ ایک بزرگ خاتون اپنے بچوں کو لیکر بریلی وارد ہوئیں اور یہیں بس گئیں۔ ان کے بچے پھولے پھلے۔ خاندانی ذہانتیں ساتھ لائے تھے، علم و فضل حاصل کیا۔ آسودہ حال ہوئے۔ جائداد بھی پیدا کرلی۔ بریلی میں اس گھرانے کے آفتاب منشی گوبند رام کے فرزند اکبر رائے بہادر منشی درگا پرشاد تھے یہ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ ذہانت و ذکاوت گھٹی میں پڑی تھی۔ عربی، فارسی، سنسکرت میں منتہی تھے۔ انگریزی زبان میں صرف انٹرنس کی سند رکھتے تھے لیکن ذوقِ علم اور جودت ذہن کی بدولت فاضلانہ استعداد بہم پہنچائی۔ اپنی فراست و فرزانگی، ذی ہوشی اور بیدار مغزی سے سرشتہ

---

[1] Golden Book of India by Sir Leith Bridge

[2] مختصر تاریخ الاقوام الکائستھ پر بھو ٹھاکر حصہ دوم مرتبہ بابو گوپی ناتھ ورمن ایم اے۔ آر۔ سی۔ ایس وغیرہ وغیرہ۔

تعلیم جیسے محکمہ میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اس زمانے میں جب صرف انگریزوں کے لئے یہ منصب مخصوص تھا۔ لکھنؤ صدر مقام تھا۔ وہیں جھاؤ لال کے پل پر اپنی کوٹھی بنوا کر رہنے لگے۔ اتنے مقتدر عہدے پر پہنچ کر بھی آپ کی وضع قطع میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ بالابر کا انگرکھا، غرارے دار پائجامہ، سر پر شملہ، یہ لباس تھا۔ عام طور پر اس وقت کائستھ شرفا کی یہی وضع تھی، ارادہ لکھنؤ میں ہی سکونت قائم رکھنے کا تھا۔ ایسا ہوتا تو کیا بات تھی۔ لکھنؤ شائستگی، نفاست، علم و ادب کا مرکز تھا۔ ہم لوگوں کے لئے تو بریلی کی سرزمین نوشتہ تقدیر ہو چکی تھی۔ یہیں محلہ بزریہ موتی لال میں مکان تھا۔ یہیں جائدادیں خریدی جا چکی تھیں۔ پنشن لینے کے بعد آپ یہیں آگئے۔ رائے بہادر کا خطاب اور "قیصر ہند" کا تمغہ سرکار برطانیہ سے ملا تھا۔ بریلی آکر آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔ وائسرائے کے دربار میں کرسی قائم تھی۔ بریلی ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکریٹری مقرر ہوئے (یہ عہدہ اس وقت اعزازی تھا) آل انڈیا کائستھ کانفرنس کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ غرض متعدد سرکاری اور قومی اعزاز سے سرفراز رہے۔ صوبے بھر میں نام نامی روشن و بلند رہا۔ ۱۸۹۴ء میں راہ گرائے عالم جاودانی ہوئے۔

آپ گیارہ سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پاتے تھے۔ ضروریاتِ زندگی کی ارزانی و فراوانی کا زمانہ تھا۔ بہت کچھ پس انداز ہوتا تھا۔ جائدادیں سستی تھیں۔ چار درو بست موضع خریدے۔ چار میں کثیر حصص۔ ایک بنگلہ خریدا۔ عالیشان مکان مع دیوانخانہ تعمیر ہوا۔ ان کے علاوہ پانسات مکان اور خرید سے گئے۔ ایک مطبع "مطلع نور" تھا جس میں آپ ہی کی تصنیفات "مجموعہ کاغذات کارروائی" "بیوہار پتر سنگرہ" "جغرافیہ گیتی" وغیرہ جو اس وقت ورنیکلر مدرسوں میں رائج تھیں۔ چھپتی تھیں۔ آمدنی وافر تھی۔ امرا کا سا رہن سہن، ساز و سامان، کارندے،

نوکر چاکر، گھوڑے گاڑیاں سب ہی کچھ تھا۔ بڑی شان واہتمام کے ساتھ تقریبیں اور تیوہار منائے جاتے تھے۔ اس تذکرے کو یا ایسی ہی اور باتوں کو جو کہیں کہیں زبان قلم پر آجائیں تعلّی یا رجز خوانی پر محمول کرنا میرے حق میں ظلم ہوگا۔ شاعر ہوں مگر تصنع شیوہ نہیں۔ ہاں بظاہر ان باتوں کو تحریر میں لانے کی ضرورت نہ تھی لیکن اپنے حالات سپرد قلم کر رہا ہوں۔ امور واقعی کو چھپا دینا بھی دیانت سوانح نگاری کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی اہمیت اور صداقت ان امور سے وابستہ ہے۔ کسی شاعر کا کلام پوری طرح سمجھنے کے لئے، اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے، اس شاعر کے مفصل حالات جاننا ضروری ہوتا ہے۔ میرے حالات میں کچھ ایسی غیر معمولی باتیں ہیں جنھیں جانے بغیر میری شاعری، خصوصاً غزل کے ہر پہلو کو سمجھ لینا اس کی باطنی کیفیتوں تک پہنچ جانا مشکل ہے۔ اس کی روح کو محسوس کر لینا دشوار ہے۔ شاعر کی طبیعت سے، اس کے دل و دماغ کی فضا سے آشنا ہونا اس وقت ممکن ہے جب اس ماحول کا آئینہ سامنے ہو جس میں اس کے مزاج اور شعور کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ جب ان تجربات کا پس منظر روبرو ہو جو اسے پیش آتے رہتے ہیں۔ اس حقیقت کے تحت میرے حالات و واقعات زندگی جاننا بھی لازمی ٹھہرتا ہے۔ یہ جان لینے اور بخوبی سمجھ لینے کے بعد وہ تمام شدید تغیرات، جو ناموافق اثرات اور نامساعدت روزگار کے باعث میرے دل و دماغ میں رونما ہو کر میری شاعری میں اثر انداز ہوئے، ہرگز غیر متعلق نہ معلوم ہوں گے۔

والدِ آنجہانی :۔ میرے دادا کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے رائے کنھیا لال آنجہانی میرے والد تھے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ سانولا رنگ

دلکش خدو خال، کشادہ پیشانی، میانہ قد، فراخ سینہ، بھرا ہوا، گٹھا ہوا کسرتی جسم، جوان ہو کر خوش قامتی اور رعنائی میں نمایاں ہوئے۔ وجاہت جسمانی کے ساتھ ساتھ دماغی جوہروں سے بھی بہرہ یاب تھے۔ ذکی و ذہین، طباع و بذلہ سنج، فارسی زبان سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ اس زبان میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی شعرا خصوصاً متصوفین کا کلام پیش نظر رہتا تھا۔ حافظ شیرازی، مولانا رومی، شمس تبریزی سے خاص عقیدت تھی۔ ان بزرگوں کے صدہا اشعار ورد زبان تھے۔ اکثر بڑی والہانہ محویت کے ساتھ بلند آواز سے انہیں پڑھا کرتے تھے یا ٹےدار مردانہ آواز، اس میں سوز، راستہ چلنے والے ٹھٹک کر رہ جاتے اور کھڑے سنا کرتے۔ انگریزی زبان میں اپنے عالم و فاضل والد ماجد کی طرح صرف انٹرنس کی سند رکھتے تھے لیکن مطالعہ کتب و مزاولتِ تحریر سے وہ قدرت پیدا کی کہ بڑی بڑی انگریز آپ کی طرز نگارش اور لب و لہجہ پر حیرت و استعجاب کرتے تھے۔ طب میں کامل ملکہ حاصل تھا۔ یہ فن آپ نے لکھنؤ کے طبیب حاذق سید محمد خاں سے سیکھا تھا۔ محض شوقیہ طور پر۔ فارسی ادبیات کے ساتھ ساتھ طبی کتب بھی تمام عمر مطالعہ میں رہیں صرف اپنے گھر والوں اور عزیز و احباب کا علاج کرتے تھے۔ ہاں جو کوئی دردمند ہر دوسری جگہ سے ناکامیاب ہو کر رجوع کرتا مایوس نہ جاتا تھا۔ ہاتھ میں شفا تھی۔ اکثر علاج ایسے معرکے کے ظہور میں آئے کہ باید و شاید۔ فن طب کو آپ وہ نعمت سمجھتے تھے جو لبشر کو نوع بشر کی تکلیف دور کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے نہ کہ دولت کمانے کے لئے، چنانچہ نہایت سقیم حالات میں بھی، جن کا ذکر آئے گا، کبھی طبابت کو وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ ملازمت کی ابتدا اسکول ماسٹری سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ آثار و قرائن کہہ رہے تھے کہ جلد انسپکٹری کے عہدے پہ پہنچیں گے لیکن فرائض فرزندی کا تقاضا ہوا کہ ملازمت کو خیرباد کہدیں۔ اٹھارہ سال بعد مستعفی ہو گئے ——— رائے بہادر مرحوم و مغفور کی پیرانہ سالی و انحطاط

کا زمانہ تھا فرزند سعید کی ضرورت تھی کہ صحت و سلامتی کا محافظ ہو۔ کچھ ایسے حالات و
اسباب رونما ہو گئے تھے کہ اطمینان و سکون قلب ہی نہیں بلکہ ان کی بیش قیمت زندگی
بھی معرض خطر میں تھی۔ لہٰذا آپ ملازمت سے سبکدوش ہو کر بریلی آ گئے۔ اپنے والد
محترم کی خدمت گزاری، راحت رسانی اور حفاظت جسم و جان کو اپنا دین و ایمان بنا
لیا۔ وہ اکثر علیل رہتے تھے کہ تقاضائے پیری و ضعیفی تھا۔ یہ ان کے علاج و معالجہ
اور تیمارداری میں مصروف رہتے تھے۔ اس خدمت گزاری و سعادتمندی کے صلہ میں
رائے بہادر آنجہانی نے تمام جائداد کا وصیت نامہ آپ کے نام لکھ دیا اور اپنے دو
چھوٹے بیٹوں کو جو علیحدہ رہتے تھے۔ ایک ایک پختہ اور عمدہ مکان رہنے کے
لئے اور پچاس پچاس روپیہ ماہوار معیشت کے لئے وصیت کئے۔ واقعات و حالات
ایسے ہی تھے کہ وصیت نامہ بالکل حق بجانب تھا ۔

دادا آنجہانی کی طرح میرے والد مرحوم و مغفور کی وضع و قطع بھی نہایت سادہ
تھی۔ بالا بر کے انگرکھے کی جگہ چھ کلیا انگرکھا پہنتے تھے ۔ غرارے دار کی جگہ چوڑی
دار پائجامہ، شملے کی جگہ خاص لکھنوی وضع کی دوپلی ٹوپی، یہ لباس گھر سے باہر کا
تھا۔ گھر پر کرتے کی جگہ بنیاین۔ دھوتی کی جگہ اڑھائی تین گز کا گاڑھے کا انگوچھا۔
یہ پہناوا انجل یا جزوی سے نہ تھا۔ درویشانہ مزاج اسی کا مقتضی تھا۔ طبیعت میں
آزادگی و وارفتگی تھی جو کس دینے یا باندھ دینے والے لباس کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔
اپنے لباس کے سوا رہنے بسنے کے طور و طریق خاندانی حیثیت کے عین شایاں تھے۔
آپ کو سرکاری اعزاز کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوئی ورنہ جلد اپنے والد ماجد کا سا
امتیاز حاصل کر لیتے پھر بھی اہلِ شہر میں بہت عظمت و وقار حاصل تھا ۔

آپ کے خصائل و فضائل بیان کرنے کے لئے دفتر چاہیئے جس کی گنجائش نہیں
صرف اتنا لکھ دینا مناسب مقام ہے کہ بچپن سے آپ کی طبیعت سادگی، سچائی،

خلوص و صفا کی طرف مائل تھی جسے تصوف کا خمیر کہہ سکتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر صوفیائے کرام کی تصانیف کے مطالعے اور لکھنؤ کے باکمالوں کی صحبتوں نے سونے میں سہاگہ کر دیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کا غلبہ بڑھتا گیا تا آنکہ ہر نفس عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس مرتبہ و مقام پر پہنچے جسے ولایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اکثر آپ سے ایسے واقعات ظہور میں آئے جو علم انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔ اور جنہیں بجز کشف و کرامات کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

تصوف کی تعلیم ہے

خاک کن بر چشم ظاہر تا بجاں بینا شوی

جو اس مسلک پر گام زن ہو زمانہ کب اس کی مساعدت کر سکتا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نامساعدت روزگار کی داستان طولانی و المناک ہے۔ صرف اتنا تذکرہ کافی ہے کہ وہ کثیر مال و متاع جو آپ کو ترکے میں ملا تھا، جس میں اپنی کمائی سے بھی آپ نے کچھ اضافہ کر لیا تھا۔ سب آپس کی خصومتوں کی نذر ہو گیا۔ رائے بہادر آنجہانی کی رحلت کے بعد بھائی بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ دونوں چھوٹے بھائی ایک طرف تھے۔ انھوں نے در عدالت کھٹکھٹایا۔ پریوی کونسل تک نوبت پہنچی۔ یہ ناخوشگوار بلکہ تباہ کن قضیہ ۱۸۹۴ء سے پندرہ سولہ سال تک بلائے بے درماں کی طرح سارے خاندان پر نازل رہا۔ الہ آباد ہائی کورٹ سے آپ کو کامیابی ہوئی۔ پریوی کونسل سے ناکامیابی۔ اب ۱۹۰۷ء تھا۔ مصائب و آلام کا دروازہ کھل گیا۔ غم و اندوہ تباہی و بربادی کی داستان روح فرسا ہے۔ وہ سیلاب آیا کہ گاؤں گرانوں، مکانات، بنگلے، گھر کا ساز و سامان سب ہی بہا لے گیا۔ جب کچھ نہ رہا عزت و آبرو پر حملے ہونے لگے۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ جینا دشوار ہو گیا۔ کہتے ہیں خاصان خدا کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ہاں آپ کا صبر و تحمل، ثبات و

استقلال یاد آتا ہے کہ دمِ آخر تک چہرے پر شکن نہ آئی۔ جو بلا سر پر آئی سکون و شکر کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ گوشت و پوست کا جسم کب تک تاب لاتا۔ قبل از وقت صحت نے جواب دے دیا۔ ۱۹۲۴ء میں فالج کا تیسرا حملہ ہوا۔ یہ پیامِ اجل تھا جس نے جان کے ساتھ جانکاہیوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اجل سے طنطنۂ عشق پیش جا نہ سکا
خموش ہو گیا آخر مریضِ ہجر خموش
(جگر بریلوی)

ملکہ شاعری آپ کی طبیعت میں خداداد تھا۔ دلؔ تخلص فرماتے تھے۔ مولانا غلام حسنین قدرؔ بلگرامی شاگردِ غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ دو چار ہی سال کی مشق میں وہ بات پیدا کر لی کہ جوہر شناس استاد قدرؔ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ سخنورانِ لکھنؤ کی صحبت، جوانی کا عالم، اُستاد کی ہمت افزائیاں، طبیعت تراوے بھرتی چلی جاتی تھی۔ جو شعر زبان سے نکلتا تھا کڑی کمان کا تیر بنکر نکلتا تھا۔ چست، پُرجوش، مؤثر، لیکن نامساعدت نوشتۂ تقدیر ہو چکی تھی۔ یہاں بھی اس نے گل کھلایا۔ جب دو چار سال میں پارہ ہائے دل نے ایک مختصر سے مجموعے کی صورت اختیار کر لی، دفعتہً مکان میں چوری ہو گئی۔ بہت سے مال و اسباب کے ساتھ متاعِ سخن بھی چور لے گئے۔ یہ صدمہ اس قدر شاق گزرا کہ پھر شعر کہنے کی قسم کھالی اور مرتے دم تک اردو میں شعر نہ کہا۔ بلکہ جو اشعار یاد رہ سکتے تھے۔ انہیں بھی بھلا دیا۔ اس پر بھی ایک غزل کے چند شعر نہ بھلائے جا سکے اور داغِ دل کی طرح طبیعت پر نقش رہے فرماتے ہیں ؎

خونِ گردن جوش پر ہے تیغِ قاتل چاہیئے
کشتیٔ عمرِ رواں ٹھہرے وہ ساحل چاہیئے
کس کو خورشید اور کس کو ماہ کامل چاہیئے
تیری صورت ہر دم آنکھوں کے مقابل چاہیئے

شعر کہنے کے لئے عالم نہ فاضل چاہیئے
کشتۂ عشق صنم ہو بس وہی دل چاہیئے
پہلے کر عشقِ مجازی تا حقیقت ہو عیاں
راہ مشکل ہے سفر منزل بہ منزل چاہیئے
عشق کیا کوئی کرے گا دل تمہارے سامنے
سوزِ غم سے دل جلانے کے لئے دل چاہیئے

ان پانچ شعروں میں شاعری کے کون سے جوہر نہیں۔ جذبات کی پاکیزگی، قوت، جوش اور نکھار سبھی کچھ موجود ہے۔ اس پر روانی اور سلاست وہ کہ فصاحت منہ چوم لے سب پر طرہ وہ گداز ہے جو شاعری کی جان تسلیم کیا گیا ہے اور جو بقول حضرت دل عشق کے بغیر ممکن نہیں۔

شعر کہنے کے لئے عالم نہ فاضل چاہیئے
کشتہ عشق صنم ہو بس وہی دل چاہیئے

چوتھے شعر کی صداقت و معنویت کے متعلق کچھ لکھنا عشق حقیقی و مجازی جیسے پیچیدہ اور نازک مسئلے کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرنا ہے جس کا یہ محل نہیں۔ اکثر اساتذہ نے کہا ہے۔

رسا اوج حقیقت پر کروں اب عشق بازی کو
بجائے نردباں سمجھا ہوں میں عشق مجازی کو (ناسخ)
خدا یاد آگیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
ملا بام حقیقت زینۂ عشق مجازی سے (آتش)

مگر جس چستی، برجستگی، جوش اور استدلالی قوت سے حضرت دل نے یہ مفہوم ادا کر دیا ہے اپنی جگہ بے نظیر ہے۔ یہاں ان اساتذہ کے مقابلے میں

حضرت دلؔ کو لانا مقصود نہیں لیکن بقول شیخ سعدی بچے کے ہاتھ اگر موتی لگ جائے موتی ہی ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

پہلے کر عشق مجازی تا حقیقت ہو عیاں
راہ مشکل ہے سفر منزل بمنزل چاہیئے

کوئی تعجب کی بات نہیں اگر حضرت قدرؔ نے اس شعر پر چار صاد کئے تھے اور تحریر فرمایا تھا" واہ رے کنھیا جوان کیا خوب کہا ہے"

اگر یہ جواہر پارے تلف ہو جانے سے بچ جاتے یا آپ ایسی سخت قسم نہ کھا لیتے تو آج اردو کے خزانے میں ایک بے بہا سرمایہ موجود ہوتا لیکن مشیت ایزدی! کیا کیا جائے!

اسی طرح دس بارہ سال کی دماغ سوزی و جگر کاوی سے ایک ضخیم کتاب تصوف میں بہ زبان اُردو تصنیف فرمائی تھی۔ صدہا فارسی اشعار اور ہندی دوہے اس کے مطالب کی وضاحت و تائید میں پیش کئے تھے۔ دُور دُور سے صوفی علماء اسے سُننے کے لئے آتے تھے۔ کل کی سی بات ہے۔ باہر صحن کے چبوترے پر ایک چٹائی بچھی ہے۔ بنیان پہنے، ننگے سر آپ اس پر بیٹھے ہیں۔ عینک لگی ہوئی ہے۔ کشادہ پیشانی دمک رہی ہے۔ چہرے پر جلال برس رہا ہے۔ ایک لکڑی کا صندوقچہ جسے آج کل آفس بکس کہتے ہیں سامنے رکھا ہے۔ اپنے صحیفہ معرفت کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اتنے میں دو مسلم حضرات مولویانہ وضع والے تشریف لاتے ہیں۔ جہاں تک یاد ہے۔ ایک لاہور کالج کے عربی کے پروفیسر تھے دوسرے واعظ۔ کھڑے ہو کر آپ تعظیم دیتے ہیں۔ اپنے مقابل کرسیوں پر بٹھاتے ہیں۔ رسمی گفتگو اور پان الائچی کی تواضع جب ہولی اُن حضرات نے فرمایا" ہم نے سُنا ہے آپ تصوف

میں کوئی کتاب لکھ رہے ہیں ہم اسے سننے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ایک مقام سے پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ ابھی چند ہی صفحے پڑھے ہیں کہ وہ دونوں حضرات زار و قطار رونے لگتے ہیں اور یہ کہکر کہ ہم آپ کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے اہل نہیں۔ آپ کے پاس چٹائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ گراں پایہ صحیفہ بھی دستبرد زمانہ سے نہ بچ سکا۔ آخر عمر میں فارسی کہنے کی طرف طبیعت مائل ہوئی تھی وہ سرمایہ بھی باقی نہ رہا۔

ننھیال یہ تو تھے میرے دادا اور والد۔ اب کچھ نانا کا حال بھی بیان کر دوں کہ وہ بھی بڑے صاحب فضل و کمال تھے۔ منشی گنگا پرشاد نام۔ بریلی وطن۔ یہیں کچہری میں صدر ناظر تھے۔ فارسی کے عالم، طب میں ماہر، سخنوری میں کمال حاصل تھا۔ اوج تخلص کرتے تھے۔ خواجہ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے مجھے اپنے نانا کے دیکھنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ والد آنجہانی اکثر علمی صحبتوں میں آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ آپ کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں آپکی غزلیات کی ایک قلمی بیاض میری نظر سے گزری تھی۔ افسوس اس وقت اس کے تحفظ کا خیال نہیں پیدا ہوا۔ پیدا بھی کیونکر ہو سکتا تھا۔ نہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ گم ہو جائے گی۔ نہ یہ خیال کہ مجھے کبھی اس کی ضرورت آ پڑے گی۔ چند سال بعد جب ضرورت ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ بیاض گم ہو گئی۔ دل پر چوٹ سی لگی مگر چارہ کار ہی کیا تھا۔ والد آنجہانی کے انتقال کے بعد جب آپ کے کاغذات سنبھالے تو ان میں سے ایک غزل حضرت اوج کی بھی مل گئی۔ غزل میں چھبیس اشعار ہیں۔ چند پیش کرتا ہوں

سرخی میں نہیں کم ہیں وہ لب لعل یمن سے

دانتوں میں زیادہ ہے صفا درِ عدن سے
ہیں شام سے غربت کی سیہ تر تیرے گیسو
رخسار سے منور ہیں کہیں صبح وطن سے
شیروں کی دہاڑیں نہ سمجھ دشت میں لیلےٰ!
یہ قیس کے نالوں کی صدا آتی ہے بن سے
پر بھی نہ پرندے کا ملا فصلِ خزاں میں
ملتا ہوا صیاد گیا ہات چمن سے!
جب چاند سے چہرے پہ چھڑکتے ہیں وہ افشاں
تو ذرّے کتر لیتے ہیں سورج کی کرن سے
موچ آئے گی تلوار نہ لے ہات میں اے گل
نازک یہ کلائی ہے تری شاخِ سمن سے
اس زور سے کب گنج سے چلتی ہے ہوائی
آہوں کے شرر منہ سے نکل جاتے ہیں سن سے
کیا سیر نظر آتی ہے پھولے ہیں جو ٹیسو!
اپنی تو جنوں طبع اچٹتی نہیں بن سے!

نل عشق کی چوسر میں ہوا اوج سے مغلوب
وہ حسن کی شطرنج میں جیتے ہیں دمن سے

مضامین کے اعتبار سے تو یہ وہی رنگ ہے جو آتش کے زمانے میں عام تھا لیکن اس میں ایک خصوصیت حضرت اوج کے یہاں یہ ہے کہ بارگاہ شاعری میں قیس و لیلےٰ کے پہلو بہ پہلو نل اور دمن کو بھی کرسی دی گئی ہے گلہائے سمن کے ساتھ ساتھ ٹیسو کے پھول بھی چنے گئے ہیں۔ یہ وہ مقامی رنگ

ہے جس کی طرف جدید اُردو شاعری کے آغاز سے اب شعرا متوجہ ہوئے ہیں۔ اسلوب بیان اور طرز ادا کو دیکھا جائے تو تعریف نہیں ہوسکتی۔ فصاحت و بلاغت میں کلام ڈوبا ہوا ہے اور موسیقیت سے ہم آہنگ۔ محاکاتی محاسن تو ان چند اشعار میں جس قدر موجود ہیں دوسروں کے کلیات میں کم نظر آئیں گے ذیل کے مصرعوں میں نزاکت، لطافت اور رعنائی کی کیسی حسین و جمیل تصویریں کھینچ دی گئی ہیں۔ سبحان اللہ

ع دانتوں میں زیادہ ہے صفا در عدن سے
ع رخسار ہے منور ہیں کہیں صبح وطن سے
ع تو ذرے کتر لیتے ہیں سورج کی کرن سے
ع نازک یہ کلائی ہے تیری شاخ سمن سے

آتش کے یہاں وہ چیز بھی ہے جس سے نشتر بنتے ہیں۔ حضرت آوج نے بھی چمن کی ویرانی اور صیاد کی حسرت ستم رانی کی جو تصویر نہایت سلیس اور پُردرد زبان میں کھینچ دی ہے، شاعری کا اعجاز ہے۔ شعر کیا ہے نشتروں کا نشتر

پر بھی نہ پرندے کا ملا فصل خزاں میں
ملتا ہوا صیاد گیا ہات چمن سے

یہ تھیں وہ باعظمت ہستیاں جن سے میری مٹی کو نسبت ہے جب ان کی یاد آتی ہے رنج و غم سے بیتاب ہو جاتا ہوں۔ مگر صبر ہی کرنا پڑتا ہے آہ! ؎ تجھ سے کیا لیں انتقام اے خاکِ بے برگ و نوا
وہ کہاں ہیں مہر و مہ تجھ میں جو پنہاں ہو گئے

باب دوم

ولادت اور تعلیم و تربیت

یہ بزرگ آسمانِ فضل و کمال کے درخشندہ ستارے تھے ان کے آگے اپنا ذکر کیا کروں لیکن ضرورت ہے شروع کرتا ہوں۔ یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو میرا جنم ہوا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی اور تھے۔ والد، والدہ اور دادا حیات تھے۔ میں اپنے دادا کا لاڈلا تھا۔ وہ مجھے پیار میں 'بچو' کہا کرتے تھے۔ ضرور میری پرورش نازو نعم میں ہوئی ہوگی۔ چند سال بعد مکتب ہوا۔ مکان کے پاس ہی منشی بالک رام مرحوم ایک کائستھ بزرگ لڑکے پڑھایا کرتے تھے۔ لڑکے ان سے ننّا کہا کرتے تھے۔ ستر بہتر سال کا سن بڑا ڈیل ڈول، چوڑے چکلے بھاری بھاری قوے بڑی بڑی آنکھیں، گھنی سیاہ مونچھ، بڑے بڑے ناک کان، بچوں کو ان سے ڈر لگتا تھا۔ شراب بہت پیتے تھے۔ چھالیا ہر دم چبایا کرتے تھے۔ ایک کھرّی چارپائی پر پڑے پڑے سرخوشی کے عالم میں شاہنامہ فردوسی کے اشعار مزے لے لے کے پڑھتے رہتے تھے۔ میری تعلیم بھی آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ دو تین سال میں اردو فارسی کی کئی کتابیں پڑھ لیں۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں ڈبلیو۔ آئی۔ ایم ہائی اسکول[1] میں نام لکھا گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج بریلی سے بی۔ اے پاس کیا، فارسی، انگریزی اور فلسفہ میں علم و ادب کا ذوق بچپن سے تھا۔ دل و دماغ کی نشو و نما والد آنجہانی کے

---

[1] اب اس کا نام تلک ہائی اسکول ہے۔

زیر سایہ ہوئی۔ آپ کی زندگی میں جو رفعت و نفاست اور پاکیزگی تھی۔ اور زندگی کا جو معیار اس سے قائم تھا اس کا ذکر کیا جاچکا۔ اپنے بچوں کے اوضاع و اطوار اور ادب و آداب کی حفاظت و نگرانی اُن کی صحیح تربیت و تہذیب ہر وقت ملحوظ خاطر اقدس رہتی تھی۔ مکان کے پھاٹک کے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ حد یہ تھی کہ اپنے کنبے والوں کے یہاں بھی بیاہ برات یا کسی بھی تقریب میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک میں نے یہی نہیں جانا کہ ریل کا سفر کیسا ہوتا ہے۔ اتنی سخت نگہداشت کے دو معنی تھے۔ ایک یہ کہ بچّوں کو کوئی جسمانی حادثہ نہ پیش آجائے۔ دوسرے یہ کہ بُری صحبت کے اثر سے دور رہیں۔ نگاہوں کے سامنے سے دُوری آزادی ثابت ہوکر عادتیں اور اخلاق نہ بگاڑ دے۔ اخلاقی تعلیم و تربیت کا یہ حال تھا کہ بات بات میں .... نصیحت کے پہلو نکالتے۔ حافظؔ، صائبؔ اور مولانائے روم کے یہاں سے تائید فرماتے اور اپنی ہدایات ذہن نشین کراتے تھے۔ آپ کی زندگی کا سب سے پہلا اصول اور اپنے بچوں کے لئے پہلی ہدایت یہ تھی ؎

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کُن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

دوسرا اصول آپ کی زندگی کا راست بازی و راست کرداری تھا۔ شہر بھر میں ضدی مشہور تھے۔ اصولوں کے پابند لوگ ضدّی ہی کہے جاتے ہیں۔ آپ بھی اپنے قول سے نہیں ہٹتے تھے۔ اوّل تو بے سوچے سمجھے کوئی بات منہ سے نکالتے ہی نہیں تھے اور جو بات منہ سے نکل گئی پتھر کی لکیر ہوگئی۔

ایک خاص وصف وقار نفس کا پاس تھا۔ اکثر زبانِ مبارک پر رہتا تھا۔

پرتو منت کند دلہائے روشن را سیاہ
میکشد دستِ حمایت شمعِ مغرور را

اگر صرف اسی وصف کے متعلق آپ کی زندگی کے واقعات لکھے جائیں تو ایک دفتر ہو جائے۔ خودداری میں آپ کی نظیر آج تک میری نظر سے نہیں گزری حد یہ کہ بچپن میں بھی کھیل کود، کھانے پینے اور میلوں ٹھیلوں کی سیر کی عمر ہوتی ہے، اپنے والدین کے آگے بھی کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس خودداری کا کیا ٹھکانا! شدید کشمکش حیات کے زمانے میں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، وضعداری اور آن بان نے زندگی کو تلخ سے تلخ تر بنا دیا لیکن کبھی اپنی روش میں فرق نہ آنے دیا۔ سخت سے سخت تکلیف کے وقت بھی زبان مبارک سے یہی نکلتا تھا

مر جائیے نہ ناز مسیحا اُٹھائیے۔

آپ کو ظاہر داری سے سخت نفرت تھی۔ کبھی رسمی پوجا پاٹ کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ تزکیہ نفس و تصفیۂ باطن میں مشغول رہتے تھے۔ شب بیداری کے خوگر تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ آپ کے بچے بھی اسی روش پر چلیں۔

یہ چند کمالات و حالات اس باعظمت ہستی کے مختصراً بیان کئے گئے جس کی نظیر اب زمانہ پیش نہیں کر سکتا۔ مقصود گزارش یہ نہیں کہ راستباز اور خوددار انسان یا خدا پرست و خدا رسیدہ بزرگ موجود نہیں۔ لیکن اس مادہ پرست زمانے میں کتنے ہیں اور وہ پاکیزہ تہذیب شگفتہ اخلاق، وضعداری، خلوص۔ پاس حمیت، جو ہمارے قابل احترام اسلاف کے زیور تھے اب کہاں نظر آتے ہیں۔ اور آج کل کے تعلیم یافتہ جوان بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ ایسے پاک نفس تو دور رہے، بھارت ورش میں اس وقت حیوانیت کا دور دورہ ہے

انسان کے لئے اب روتی ہے روح دنیا
روتا ہو جیسے کوئی راتوں کی تیرگی میں!

میری مادرِ مہربان شُدبُد ہندی پڑھی تھیں لیکن نہایت ذی ہوش اور سلیقہ مند تھیں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔ میرے ادب و آداب اور عادات و خصائل پر سختی سے نظر رکھتی تھیں۔ نو دس سال کی عمر تک مہر مادری کی برکتیں مجھے نصیب رہیں۔ پھر ہمیشہ کے لئے ان سے محروم ہو گیا۔ ہاں ایک عارف کامل کا ظلِ پدری سر پر پایا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس باعظمت ہستی کے مزاج سے بھی کچھ ورثہ میں ملا۔ اس پر آپ کا ہر گھڑی کا فیضان تربیت لڑکپن ہی سے طبیعت کچھ غیر دنیوی سی ہو گئی۔ تعلیم حاصل کرنے پر فارسی ادب کے مطالعے نے اس رنگ کو پختہ کر دیا۔ گھر پہ آلام و مصائب کا تواتر و تسلسل شروع ہونا گویا تہذیب نفس کی عملی تعلیم کے دور کی ابتدا تھی جس کے ہر پہلو کو والد آنجہانی سمجھا سمجھا کر ذہن نشین کرتے تھے۔ آخری فیصلہ یہ ہوتا تھا

نشۂ عشق بہ پیمانۂ آزار دہند
ہر شگافِ دلِ خود را در میخانہ شُمُر!

میرے شوق بچپنے کے کھیلوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ بہت سے کھیل کھیلتا تھا۔ پتنگ اڑاتا تھا۔ کرکٹ کھیلتا تھا۔ کرکٹ سے بہت شوق تھا اور مدتوں رہا۔ کالج میں آ کر ٹینس کا بھی شوق ہُوا۔ یہ بھی بہت دنوں رہا۔ بڑے بھائیوں کو کشتی، پٹہ، بنوٹ وغیرہ سکھانے کے لئے اچھے اچھے اُستاد نوکر رہے۔ بانک مَیں نے بھی سیکھی اور کشتی تو نہیں، کسرت کا شوق تھا۔ نقش و نگار اور تصویریں بنانے کا شوق بچپن سے تھا۔ گانے بجانے کا بھی شوق ہُوا۔ آواز بُری نہیں تھی۔ گلے میں سُر تھا۔ مصوری باقاعدہ

سیکھنے کا ماحول نہ تھا۔ گانے بجانے کا انجام اچھا نہ ہوا یعنی ۱۹۱۷ء میں ستار اور طبلہ سیکھنا شروع کیا۔ مشکل سے دس پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ مجھے اپنے والد آنجہانی کے ساتھ داتا گنج ضلع بدایوں ایک تار پر جانا پڑا کہ وہاں منجھلے بھائی صاحب بہت علیل ہو گئے تھے کچھ دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت رنج والم سے میری بُری حالت تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ گانا بجانا میرے لئے بہت منحوس ہے۔ غرض کوئی شوق پُورا نہ ہو سکا۔ تسلی کے لئے اپنا ہی شعر پڑھ لیا کرتا ہُوں۔

قسمت سے داغ سینہ بنے اس کو کیا کریں
خونِ جگر میں رنگ بہت تھے بہار کے

ملازمت کے زمانے میں شکار کا شوق ہُوا اور کئی سال رہا لیکن اس کی بنیاد دلچسپی نہیں تھی بلکہ حاکمانہ شان و نمود، رفتہ رفتہ جس کی قلعی کھُل گئی۔

گانے بجانے سے شوق ہونے کے باوجود تھیٹر عمر بھر میں دو بار دیکھا۔ ایک بار دس بارہ برس کی عمر میں رومیو جولیٹ کا تماشا دیکھا۔ اس کے آخری سین میں جولیٹ کی قبر کھودنے کے بعد اس کی صورت دیکھ کر جب رومیو نے گانا شروع کیا۔

بعد مُردن بھی بہارِ رخ روشن ہے وہی
بھولی صورت ہے وہی اور ترا جوبن ہے وہی

تو مَیں وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے بعد مدتوں تک تھیٹر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ سینما سے نہیں معلوم کیوں ابتدا سے ہی پرہیز رہا ہے صرف دو تین بار سینما دیکھا ہے وہ بھی کارِ منصبی کے سلسلہ میں۔

شادی اور اولاد

۱۹۱۳ء میں شادی ہوئی۔ محلہ پرمٹ گھاٹ شہر کانپور کے رہنے والے منشی پرمیشری دیال جی آنجہانی ایک نہایت معزز اور آسودہ حال بزرگ میرے خسر تھے۔ آپ نے ۱۹۳۶ء میں رحلت فرمائی۔ شری امبکا پرشاد اور شری جاگیشور دیال نشتر دو فرزند چھوڑے۔ بڑے کاروبار کرتے ہیں اور چھوٹے وکیل سرکار رہے اور اب کانپور کے نامور وکیلوں میں ہیں۔ میری اہلیہ ویسی ہی ثابت ہوئیں جیسی ایک آدرش ہندو عورت ہو سکتی ہے۔ ان کا بچپن اور جوانی کی عمر راحت اور آسائش میں گزری۔ ہمارے سب سے بڑے بیٹے کی وفات اور ملازمت سے میری علیحدگی سے ان پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس میں ان کی سیرت کے جوہر بھی کھل گئے۔ جس طرح ہنس ہنس کر اور ہر وقت خوش رہ کر نہایت صبر اور استقلال سے گرہستی کی سخت سے سخت خدمتوں کا بار انہوں نے تنہا اٹھایا۔ وہ ہندو دیویوں کی روایتی خصوصیات کے عین شایاں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں کی جفاکشیوں، راحت رسانیوں اور شیریں کاریوں کی بدولت زندگی کی دشواریاں آسان اور تلخیاں گوارا ہوتی چلی گئیں۔ اور بچوں کی پرورش اور تعلیمی زندگی میں اسلوب و ثبات قائم رہا۔

اس وقت تین بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے بڑے دن کی رات کو وہ سانحہ مجھ پر گزرا کہ کلیجہ منہ کو آگیا۔ آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ میرا سب سے بڑا اور جوان العمر بیٹا گنگا موہن رائے نامی دو گھنٹے میں دفعتہً دنیا سے اٹھ گیا۔ نامی کو دل و دماغ کے درخشندہ ترین جوہر عطا ہوئے تھے۔ سعادت مندی ماں باپ کی اطاعت و خدمت گزاری میں آپ اپنی مثال تھا۔ میری پیرانہ سالی کی تمام امیدیں اس سے وابستہ تھیں۔ اس کی جواں بختیوں کو

چکنے کے لئے دو تین سال گزر جانے کا ہی انتظار تھا مگر میری قسمت میں اس کی جوانمرگی کا داغ تھا۔

یار و احباب بچپنے میں محلے کے دو چار لڑکوں سے یاری رہی۔ صرف اتنی کہ وہ میرے گھر آجاتے تھے اور کھیل کود میں شریک ہوتے تھے۔ جب میں اسکول میں داخل ہوا دو چار ہم جماعتوں سے یارانہ رہا۔ ان کے ساتھ خوب چہچہے، قہقہے رہتے تھے۔ میں نے کبھی کسی سے یارانہ میں سبقت نہیں کی۔ علاوہ اس کے طبیعت کبھی ایسے ساتھیوں کی طرف مائل نہ ہوئی جن میں بداطواری یا آوارگی دیکھی۔ کالج میں آکر تین دوست ملے۔ پاکیزہ خو تو تینوں تھے اور مخلص بھی۔ دو ادبی مذاق بھی رکھتے تھے اور خوش طبع بھی تھے۔ ایک ان میں سے جامع کمالات اور فرشتہ صفت بھی ثابت ہوا۔ ان کی صحبتوں میں قہقہے چہچہے بھی رہتے تھے، لطیفے اور بذلے بھی، شاعرانہ و ادیبانہ گفتگوئیں اور بحث مباحثے بھی۔ یہ دوستیاں غیر معمولی نعمت تھیں۔

ملازمت بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد آگے پڑھنے کا شوق مجھے بے چین کئے تھا۔ اس زمانے میں بریلی میں ایم۔ اے تھا نہ ایل ایل۔ بی کا کلاس۔ حصولِ تعلیم کے لئے کہیں باہر جانا میرے لئے ناممکن تھا زمانہ بگڑ چکا تھا۔ معاش کی پریشانیاں تھیں۔ والد آنجہانی کے سر اپنا، اپنی بیوی اور ایک بچّی کا بوجھ ڈالے رکھنے سے مجھے بڑا دُکھ تھا۔ اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رویا کرتا تھا اور دعا مانگتا تھا۔ ملازمت کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ پہلے بریلی مشن اسکول میں ماسٹری مل گئی۔ ایک سال وہاں گزرا۔ دوسرے سال نائب تحصیلداری میں منظور ہو گیا۔ ۱۱ رمئی ۱۹۱۸ء سے کام شروع کر دیا

اب تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کے خواب نظر آنے لگے۔ڈپٹی کلکٹری کے لفظ میں کتنا نشہ ہے۔زمانہ بگڑ جانے سے خاندانی وقار میں ضعف آجانے کا اندیشہ سوہان روح بنا ہوا تھا۔خاندانی وقار و وجاہت کے الفاظ بھی کتنا بندار اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔مجھے بھی اپنے خاندان پر فخر و ناز تھا اور کیوں نہ ہوتا۔لوگ ہمیں بچپن سے "رائے صاحب" اور "کنور صاحب" کہہ کے پکارتے تھے۔ایسی صورت میں بڑی فکر تھی کہ خاندانی اعزاز و افتخار میں انحطاط نہ آنے پائے۔ارمان تھا کہ میں اسے اور رفیع کرسکوں۔دل آئندہ کے سبز باغ دیکھ دیکھ کر خوش تھا مگر نوشتہ تقدیر سے بے خبری تھی ہاں والد آنجہانی کی پیشینگوئی تھی کہ یہ ملازمت اس لڑکے سے نہیں نبھیگی۔پانچ سات سال بعد معلوم ہونے لگا کہ یہ پیشینگوئی صحیح ثابت ہوگی۔طبیعت کا خمیر کچھ تھا۔جس روش پر تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس کا کچھ تقاضا تھا۔ ذوقِ شعر و ادب اور دن رات کا ادبی انہماک حریت پسندی اور آزاد روی کے معاون تھے۔شرائط ملازمت کچھ اور ہی ثابت ہوئے آخر انجام وہی ہوا جو والد آنجہانی کی طبع نورانی پر منکشف ہوچکا تھا۔

نائب تحصیلداری سے ملازمت شروع کی تھی۔کم و بیش پچیس سال بعد نائب تحصیلداری ہی سے پنشن لی۔جیسا لکھ آیا ہوں۔ابتدا میں بڑا ارمان ڈپٹی کلکٹر ہونے کا تھا۔ابتدائی دو چار سال کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ یہ خواب جلد سچا ہونے والا ہے۔حکام خوش، ماتحت ان سے زیادہ خوش، اہل معاملہ اور پبلک سب سے زیادہ مطمئن اور مداح۔یہ دل خوش کن حالات تھے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں یوپی کے مشہور تندمزاج بلکہ وحشی کلکٹر مسٹر نیدرسول[1] سے سابقہ پڑ گیا۔یہ میری

---

[1] آپ وہی ہیں جو ۱۹۴۲ء کے مظالم کے لئے ملک کی سیاسی تاریخ میں یاد رہیں گے۔ضلع بلیا وغیرہ کے لوگ ہمیشہ آپکو دعائے خیر سے یاد کریں گے۔وہاں آپ نے گاؤں کے گاؤں پھنکوا دیئے تھے۔

زندگی میں ایک یادگار معرکہ ہے۔ اُدھر حاکمانہ غیظ و بدمزگی اور معزولی کی دھمکی، ادھر احساسِ بے گناہی و مؤدبانہ بے باکی و صاف گوئی، اُدھر ایک شہتیر کا شہتیر سفید چمڑے والا فرنگی، ادھر ایک منھنی سا مختصر سا کالا آدمی۔ شاہین و عصفور کا سامنا تھا۔ سزا یہ ملی کہ میرا اعمال نامہ جس قدر سیاہ ہو سکتا تھا۔ اُنھوں نے سیاہ کر دیا۔ اثر و رسوخ والے میرے بعض ہمدردوں نے ہر چند کہا کہ چلئے ہم آپ کو کلکٹر کے پاس لے چلیں، وہ معاف کر دے گا۔ آپ کے حق میں یہ بے حد مُضر ہُوا ہے۔ مجھے بھی بخوبی اس کا احساس تھا۔ لیکن نیدر رسول کے پاس جانا گوارا نہ ہُوا۔ بے گناہی اور اُلٹی معذرت چاہنا۔ دل کہتا تھا یہ ذلت نہ اُٹھے گی نہ اُٹھے گی۔ ادھر یہ بھی بھروسہ تھا کہ کلکٹر سے بالاتر حکام انصاف کریں گے۔ یہ فریبِ وہم نکلا۔ اپیل میں کچھ نہ ہُوا اور ہوتا بھی کیا۔ ایک حاکم ذی اقتدار۔ اور نہایت ادنےٰ ماتحت کے درمیان معاملہ تھا۔ نامہ اعمال کا اندراج قائم رہا۔ دس بارہ سال تک ترقی کے لئے کوشش تو برابر جاری رہی مگر گرمجوشی رفتہ رفتہ فنا ہو گئی وہ خفیف اور خفیہ ذرائع تو میں نے کبھی استعمال نہیں کئے جو مجھ سے کم مدت والے ہم منصب استعمال کر کے مجھ پر سبقت لے گئے۔ جوں جوں ترقی کی خواہش اور امید مٹتی گئی طبیعت میں سکون اور قناعت کا پہلو نکلتا چلا آیا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا کہ مجھے اس بات کا قطعی افسوس نہ رہا کہ میں تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر کیوں نہ ہُوا۔ اپنے نصیب کے چند دانوں کو ایک خرمن سمجھتا تھا۔ ناجائز یافت سے کبھی سروکار نہ رکھا۔ جب دورے پر جاتا تھا کھانا گھر سے لیکر جاتا تھا۔ شروع میں ساٹھ روپیہ ماہانہ پائے، کوئی دو سال تک۔ پھر سو روپیہ۔ آخر میں پانچ سات سال سے ڈیڑھ سو روپیہ پا رہا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ ساتھ خانہ داری

کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی گئیں۔ آٹھ بچے میرے تھے۔ ادھر کئی برس سے ایک چھوٹے بھائی ایک بیوہ بھاوج ان کا لڑکا بھی ساتھ تھے جب حیثیت رہن سہن بچوں کی تعلیم، گھر گرہستی کے دیگر مصارف، تنخواہ ان سب کے لئے کافی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بہت ہو گیا کہ دو لڑکیوں کی شادی کے فرائض سے سبکبار ہو گیا۔ پس انداز کچھ ہوتا نہ تھا نہ پس انداز کرنے کی کچھ زیادہ فکر ہوئی۔ عقیدہ راسخ تھا

جس نے پیدا کیا ہے پالے گا۔!

اور اطمینان یہ تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد پچھتر روپیہ ماہوار پنشن کے ملیں گے۔ کچھ تصنیف و تالیف سے مدد ملے گی۔ قناعت و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ سب سے زیادہ تقویت بڑے لڑکے سے تھی۔ قوی امید تھی کہ جب تک پنشن کا زمانہ آئے گا اس کی جواں بختیاں کچھ اثر دکھائیں گی۔ سو سب سے پہلے اسی کو اجل نے تاکا۔ ساری امیدیں یک بیک خاک میں مل گئیں۔ میں نوشتۂ تقدیر کا قایل رہا ہوں۔ زندگی کے واقعات و تجربات نے اس عقیدے کو اور بھی پکا کر دیا۔ انسان کی زندگی کے واقعات و حالات مقدرات سے ہیں۔ ان مقدرات کی علت انسان کے اعمال ہوں یا کچھ اور، یہاں اس بحث میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میری زندگی میں جو کچھ پیش آیا یقیناً مقدرات سے تھا۔ ملازمت راس نہ آئی۔ ظاہرا اس کے اسباب یہ تھے۔ اول یہ کہ اپنے حقوق کے مطالبہ کرنے میں کسی کی سعی و سفارش تلاش کرنے کا خیال تو دُور خوشامدانہ لب و لہجہ سے بھی مجھے عار رہا۔ ضمیر فروشی ہوئی نہیں۔ آزادانہ رائے کے اظہار میں کبھی باک نہ ہوا۔ اکثر کلکٹروں کے منشا بلکہ علانیہ حکم کے خلاف اپنی رائے کے اظہار پر مجبور ہو گیا۔

ملازمت میرے لئے راحت کا گہوارہ کیونکر بن سکتی تھی۔ میں اس میں کیا پھل پھول سکتا تھا۔ میرے لئے یہ دَور آزمائش کا مسلسل دور تھا۔

ملازمت کے زمانے میں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کا اختتام اور جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کا کل دَوران دیکھا۔ اس زمانے میں قانون گویوں، نائب تحصیلداروں اور تحصیلداروں نے سرکاری خیر خواہیوں میں بڑی بڑی گرم جوشیاں اور سرگرمیاں دکھائیں۔ چندہ جمع کرنے اور رنگروٹ فراہم کرنے میں زمین و آسمان ایک کر دئے۔ میں نے دونوں جنگوں میں نہ ایک رنگروٹ فراہم کیا نہ ایک حبہ چندہ جمع کرنے کی سعی کی نہ ایک پیسہ خود دیا۔ اس سے بچ کیونکر گیا۔ یہ معجزہ تھا رنگروٹ فراہم کرنا میرے لئے اپنی گردن پر خون لینا تھا۔ چندہ جمع کرنا اپنی غلامی کی زندگی کو تقویت پہنچانا۔ اپنی یا قوم کی غلامانہ زندگی کا شدید احساس تھا۔ جو مظالم ابنائے وطن پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی میرے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب پہلی بار مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون اور ترک موالات کا زور ہوا میں بھی ترک ملازمت پر آمادہ ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں مسٹر بنیڈر سول کے جابرانہ طرزِ عمل سے مجبور ہو کر ایک بار پھر چاکری کی زنجیریں توڑ ڈالنے کا سودا سر میں سمایا۔ کیوں کہوں کہ احباب و اعزاء کے پند و نصائح اور بزرگوں کی زجر و توبیخ نے باز رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں غم معاش کی تلخیوں کا اندازہ کر چکا تھا۔ پھر اس کا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ صدیوں سے جو افراد غلامی کی زبوں و زار زندگی بسر کر رہے ہوں ان کے کیا ارادے اور ان ارادوں کا کیا ثبات؟ کئی بار اس بات کی کوشش کی کہ ملازمت کسی دوسرے صیغے میں منتقل ہو جائے یہ بھی نہ ہوا۔

میری ملازمت ادنیٰ تھی مگر آئندہ ترقیوں کے لحاظ سے محسود۔ میں اسے لات مار رہا تھا۔ یہ کوئی عقل کی بات نہ تھی مگر کیا کروں مجبور تھا۔ بالکل مجبور تھا

سمائی سر میں ہو جس کے ہوا بیاباں کی
قفس نہیں ہے تو اس کے لئے چمن کیا ہے

میں ملازمت سے دل برداشتہ ہی نہیں واقعی بیزار تھا۔ یہ مجھ سے کیونکر موافقت کر سکتی تھی۔ اب تو اس کی اذیتوں سے روح گھٹنے لگی تھی۔ آخر جس لمحے نور نظر نامی کو اجل آئی اور میرے منہ سے چیخ اور آنکھوں سے آنسو نکلے، بے اختیار یہ دعا بھی لب پر آ گئی "پروردگار! اب مجھے ملازمت کی لعنت سے بھی نجات دے دے"! یعنی جو کچھ مجھ پر گزرنا ہے گزر جائے۔ خوب جانتا تھا کہ میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے معاش کا کہیں ایک دن کا بھی ٹھکانا نہیں مگر روح کی کیفیت زبان پر آ ہی گئی۔ ایک شعر میں نے کبھی کہا تھا۔ شاید اس کے مطابق آزمائش ہونا تھی۔

کُود پڑ دریا میں کیا طوفان کا ڈر کشتی کی فکر
ہے اگر تجھ کو یقین فضلِ خدا ہو جائے گا

چار ماہ کی رخصت لے کر بریلی آیا۔ یہاں صحت ایسی بگڑی کہ ملازمت کے قابل ہی نہ رہا۔ شروع ہفتہ جنوری ۱۹۴۳ء میں بریلی آیا تھا۔ مئی ۴۳ء میں سدردوار کے دورے پڑنے لگے۔ لیٹے لیٹے جب کروٹ بدلتا تو دماغ میں ادھر سے اُدھر کوئی بھاری چیز منتقل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ آنکھوں کے سامنے ہر شے ہلتی ہوئی نظر آتی۔ صحت بگڑتی ہی گئی۔ پہلے برابر رخصت پر رہا آخر کار پنشن پر جانا پڑا کہ میڈیکل بورڈ نے ملازمت کے ناقابل قرار دیدیا۔

نومبر ۱۹۴۳ء سے پنشن مقرر ہو گئی۔

ملازمت کے بعد میں بریلی ہی میں تھا۔ صحت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ ۵ مئی ۱۹۴۴ء کی شام کو عجیب قسم کا اعصابی دورہ پڑا۔ یہ معلوم ہوا کہ بیچ دماغ سے کوئی شے نیچے کو سرک گئی۔ بیہوشی طاری ہو گئی۔ میں زمین پر آ رہا۔ چند ہی سیکنڈ یہ حالت رہی۔ اس دورے نے صاحب فراش کر دیا۔ کئی مہینے چلنے پھرنے سے معذور رہا۔ آنکھیں اور دماغ بیکار ہو گئے۔ نہ لکھ سکتا تھا نہ پڑھ سکتا تھا۔ لفظوں پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہومیوپیتھک علاج سے بہت فائدہ ہوا۔ یعنی اتنا کہ میل دو میل چلنے کے قابل ہو گیا۔ کچھ غور و فکر بھی ہونے لگا۔ کچھ لکھنے پڑھنے کا بھی سلسلہ نکلا۔ اس سے زیادہ کسی علاج سے فائدہ نہ ہو سکا۔ آخر دوا دارو علاج معالجہ سب کو خیر باد کہہ دیا۔

پنشن کے کاغذات ڈھائی سال تک مرتب نہ ہو سکے۔ فروری ۱۹۴۵ء کو چالیس روپیہ ماہوار الاؤنس ملنے کا حکم ہوا۔ مئی ۱۹۴۶ء سے پنشن ملنا شروع ہوئی۔ میں تنخواہ سے نصف پنشن کا مستحق تھا۔ پنشن بجائے چھتر کے اکیاون روپیہ پانچ آنے مقرر ہوئی۔ یہ مسٹر نیدر سول کا کرم تھا جو اس وقت بریلی میں کمشنر تھے۔ مختصر یہ کہ جوان بیٹا گیا۔ ملازمت گئی۔ پنشن کی آمدنی برائے نام۔ بچے سب کم عمر، خانہ داری کی بھاری ذمہ داریاں بدستور قائم۔ ادھر بچوں کے لکھے بے پڑھے رہ جانے کے خیال سے میری جان پر صدمہ سا گزرتا تھا۔ جسے میں برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر ضروریات زندگی کی گرانی[1] الاماں! دماغ اور

---

[1] ضروریات زندگی کا نرخ قبل از جنگ ۱۹۴۴ء کے مقابلہ میں سات آٹھ گنا بڑھ گیا۔ جتنی چیز زیادہ ضروری تھی اتنا ہی نرخ گراں تھا۔

قلم پر بھروسہ تھا کہ لبعد ملازمت کام آئیں گے۔ سو صحت جسمانی کا یہ حال کہ جیسے برسوں کا مریض۔ غرض

سرگذشت دلِ ناشاد جگر کیا کہیئے
کہنے والی ہے بہت بات مگر کیا کہیئے

جولائی ۱۹۴۷ء سے ایک مقامی انٹر کالج میں عارضی طور پر ٹیچر ہو گیا تھا۔ ساٹھ روپیہ ماہانہ اس سے ملتے تھے۔ ۱۹۵۱ء تک یہ سلسلہ رہا۔ پھر خرابی صحت نے بالکل معذور کر دیا۔ میرے ایک فرشتہ خصلت دوست نے میری زندگی کی مشکلوں[1] کو آسان کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر کشمکش حیات ناقابلِ برداشت ہی رہی۔ کم و بیش دس سال جس طرح بھی گزرے، گزرے۔ بچوّں کی تعلیم میں خلل نہیں پڑنے دیا۔ جون ۱۹۵۲ء میں بریلی کو الوداع کہکر میرٹھ آ گیا۔ بڑا لڑکا یادو موہن رائے گرامی دیو ناگری انٹر کالج میرٹھ میں اور منجھلا مادھو موہن رائے جامی میرٹھ کالج میرٹھ میں پروفیسر ہے۔ دونوں ایم۔اے ہیں اور انگریزی پڑھاتے ہیں۔ تیسرا لڑکا جگت موہن رائے سامی بھی ایم۔اے ہے اور الہ آباد میں ایک مقامی انٹر کالج میں انگریزی پڑھاتا ہے۔ اب یہ حالات تھے یعنی بنتے بگڑتے، بگڑتے بنتے کچھ آسودگی و راحت کی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بریلی میں دس سال جن سقیم حالات میں گزرے تھے میں انہیں بھولنے لگا تھا۔ کچھ اطمینان کی سانس لینے لگا تھا کہ ۵ر جولائی ۱۹۵۷ء کی شام کو ایک آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ بیٹھے بٹھائے دفعتہً ایک سخت واردات[2] پڑوس میں رونما ہو گئی۔ چھوٹے لڑکے رادھے موہن کا سر پھٹ گیا۔

---

[1] اس کی مفصل کیفیت بریلی کے رسالہ آواز کے شمیم نمبر میں درج ہے۔

[2] اس کے مفصل حالات میری انگریزی کتاب مسٹریز آف مائی مائنڈ میں تحریر ہیں۔

ایک لڑکے کے ہاتھ سے حفاظت خود اختیاری میں بندوق چل گئی۔ حملہ آور بائیں گھٹنے میں زخمی ہو کر گر گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ شدنی اس کو کہتے ہیں بلائے ناگہانی یوں نازل ہوتی ہے۔ بس میرے تین لڑکوں اور میرے داماد کے ملازم پر پولیس نے اقدامِ قتل کا مقدمہ چلا دیا۔

۵ رجولائی کی شام سے کم و بیش تین مہینے تک جس کوفت، ہراس اور دوڑ دھوپ میں ہم لوگوں کے لیل و نہار گزرے ہیں، بیان نہیں ہو سکتا۔ گھر میں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی موت ہو گئی ہے۔ میں نے خاندانی ثروت و امارت کی تباہی بھی دیکھی۔ لڑکے کا دل گداز غم بھی اُٹھایا۔ معاش کی سخت کشمکش بھی جھیلی مگر جن رُوح فرسا تردّدات میں یہ شب و روز گزرے میں جانتا ہوں یا میرے گھر والے۔ جو جرم لگایا جا رہا تھا اس کی پاداش کا خیال آتا تھا تو رُوح کانپ کانپ اُٹھتی تھی۔ آخر ۲۴ ستمبر کو کچھ اطمینانی صورت پیدا ہو گئی۔ اور ۲۳ دسمبر ۵۷ء کو عدم دستیابی ثبوت میں مقدمہ خارج ہو گیا۔

میری زندگی جس دور سے گزری اس کا سچا اور مختصر حال میں نے پیش کر دیا۔ اپنا حال لکھنا تھا یہی اس کا مقصود ہے اور کچھ نہیں۔ بظاہر یہ حزین و ناشاد زندگی کی رام کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ بچپن جس طرح بھی گزرا ہو۔ ہوش سنبھالتے ہی گردشوں کا سامنا ہو چلا۔ آسودہ حالی کی بساط اُلٹ گئی۔ جسمانی تکلیفیں بھی اُٹھائیں۔ روحانی ایذار بھی۔ ملازمت سے دنیوی میدان میں قدم رکھا۔ جو کچھ زندگی میں پیش آنا تھا اس کی پیشینگوئی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ والد آنجہانی کی زبانی ملازمت کے متعلق اور خود میرے اشعار کے ذریعہ آئندہ زندگی کے متعلق بہرحال قدرت کا منشا پورا ہو رہا تھا۔

مانند شمع چاہے وہ جلنا ہی کیوں نہ ہو
اپنی حیات کا بھی ہے کچھ مدعا ضرور

ملازمت کے زمانے میں معاش کی تکلیفیں تو نہ تھیں جزوریات زندگی حیثیت کے مطابق حاصل تھیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ عمر کے ساتھ ساتھ دل کی حساسی، آزادہ روی اور اپنے خیالات کی پرستاری بڑھتی ہی گئی۔ طبیعت قول، فعل اور خیال میں ہم آہنگی چاہتی تھی۔ مصالح کار منصبی اور "رموز مملکت" کا تقاضا کہ ان سب میں اختلاف رہے۔ ملازمت کے شرائط اور رجحانات باطنی میں روز بروز کشاکش بڑھتی گئی اور ہر وقت کی اذیت بن گئی۔ گھبرا کر اس سے نجات کا طالب ہوا۔ نجات ملنے کے بعد جو حالات پیش آئے وہ بھی کچھ خوشگوار نہ رہے۔ یہ تھے وہ واقعات جن سے زندگی حزن و ملال کی مسلسل داستان بنتی چلی گئی۔ لیکن اپنی زندگی پر مجھے افسوس نہیں ہوا۔ اس لئے کہ زندگی اسی سے عبارت ہے جو مجھے پیش آیا ؂

زندگی اک محشرِ خاموش ہے رستخیزِ غم بقیدِ ہوش ہے

(جگر بریلوی)

باب سوم

شاعری کی بدایت و نہایت

کسی میکدے میں رہا جگر کہ تھا محوِ خواب میں رات بھر
ہوئیں کیا بشارتیں صبح دم کہ اٹھا تو زمزمہ خواں اٹھا

لکھ آیا ہوں کہ اردو فارسی کی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی۔ اسکول میں داخل ہو جانے کے بعد بھی مولوی انتظام علی مرحوم مجھے مکان پر اردو فارسی

پڑھاتے رہے۔ ایک دن کچھ پڑھا رہے تھے کہ کوئی موزوں مصرع میری زبان سے نکل گیا۔ والد آنجہانی وہیں ٹہل رہے تھے۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دیے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس اشارے اور تبسّم کے معنی تو میں سمجھ گیا اور کبھی کبھی یہ واقعہ مجھے یاد بھی آیا کیا لیکن بیس اکیس سال کی عمر تک شعر کہنے کا خیال بھی کبھی نہیں آیا ہاں شاعرانہ جذبات اندر ہی اندر نشو و نما پاتے رہے۔ بچپنے میں پانسات برس کی عمر سے یہ حال تھا کہ خوبصورت تصویریں، رنگین منظر، شیریں نغمے، نشاط و حزن کی متضاد کیفیتیں دل میں پیدا کر دیتے تھے۔ خوشی کا جوش اُٹھتا تھا۔ ساتھ ہی دل پر چوٹ بھی لگتی تھی جس سے انبساط کے بجائے افسردگی مسلّط ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے دل مسوس دیا۔ والد آنجہانی کے ہمراہ اکثر گاؤں کو جایا کرتا تھا۔ بہت تڑکے وہ روانہ ہوتے تھے۔ صبح کا سہانا سماں، ہلکی ہلکی دھوپ لہلہاتے ہوئے ہرے ہرے کھیت، جھیلوں اور تالابوں کا موجیں مارتا ہوا چاندی سا پانی، دُھوپ، چھاؤں کرتی ہوئی موجیں، ہرے بھرے درختوں پر پرندوں کی سُریلی تانیں ایسی ہی الم انگیز نشاط پیدا کرتی تھیں۔ برسات کا عالم ہی نرالا ہوتا تھا۔ دُھواں دھار بادل، سرسبز مناظر، شام و سحر کے آسمان کی رنگینیاں دل میں آگ لگا دیتی تھیں۔ برسات آتی، گھر میں ہنڈولا گڑتا۔ جھولے پڑتے۔ بہنیں بھاوجیں، رنگ برنگی چُنریاں اوڑھے جھولا جھُولتیں۔ کوک کوک کر ساون ملاریں گاتیں۔ میرا دل الم و مسرّت کی کیفیتوں میں ڈوبتا اُچھلتا۔ نشاط کا طوفان اُٹھتا مگر ایک بھولانہ ہوک کے ساتھ جیسے کوئی اپنی تمام رنگینیوں اور کرشمہ سازیوں کے ساتھ پاس آ آ کر دور ہو جاتا ہو۔

شعر گوئی کی ابتدا یوں ہوئی۔ جب میں انٹرنس میں تھا اپنے ایک ہم جماعت سید امانت حسین شاد بریلوی کی ترغیب بلکہ اصرار سے پہلی غزل کہی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہتا رہا مگر بہت کم۔ یعنی سال میں چار چھ غزلیں رسمی قسم کی۔ ابھی اس شاعری میں خلوص نہیں پیدا ہوا تھا۔ اوپری اوپری سی چیز معلوم ہوتی تھی۔ غم کا عنصر ضرور موجود تھا کہ حالات کا تقاضا تھا۔ جذبات کا طوفان ابھی اس سے دور تھا۔ اب میں کالج میں آگیا۔ اس وقت تک میری عمر جس ماحول میں بسر ہوئی تھی وہ معنیاً بالکل شاعرانہ تھا۔ والد آنجہانی کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ خود تو کہنا ترک کر چکے تھے مگر شعر و سخن کے شیدائی عمر بھر رہے۔ یہ آپ ہی کی علمی و ادبی صحبتوں کا فیض تھا کہ مجھے بھی رفتہ رفتہ شاعری سے حقیقی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ طبیعت کا ایک مخفی عنصر نشو و نما پانے لگا لیکن شعر کہنے کا خیال مدت تک نہ آیا۔

اب ایک اور باب کھلتا ہے۔ ادھر ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک چار برس سول لائن میں اپنے بنگلے میں قیام رہا۔ اس بنگلے کے احاطے میں آم اور دوسرے پھلوں کے وسیع تختے تھے۔ ایک لمبا چوڑا گڑھا تھا جو برسات میں اچھا خاصہ تالاب بن جاتا تھا۔ چاروں طرف جنگل کی سی فضا پیدا کر دیتا تھا۔ برسات کا موسم عجیب عالم میں گزرتا تھا۔ رنگا رنگ خوبصورت پرندوں کا چہکنا، چہچہانا، ادھر ادھر شاخ شاخ پر اڑتے پھدکتے پھرنا، تنکے چن چن کے آشیاں سازی میں مصروف ہونا، انڈے دینا، بچے نکالنا، ان بچوں کا چیں چیں کرنا۔ ماں باپ کے پیچھے پھدکتے ہوئے بھولے پن سے چونچیں پھیلا پھیلا کر دانہ مانگنا۔ فطرت کی یہ وہ ادائیں تھیں جن کی نشاط انگیزیاں بے پناہ ہیں۔ لیکن میرے دل میں نشاط کے

ساتھ ساتھ عجیب قسم کا درد بھی اُٹھتا تھا۔ صبح و شام گھنٹوں ان مناظر میں محو رہتا۔ کبھی کبھی کسی چڑیا کے بچے اس کے آشیانے سے نکال کر دس بیس[1] دن کے لئے پال لیتا۔ پنجرے کو ہری بھری لہلہاتی ہوئی شاخوں میں لٹکا دیتا۔ خود کسی درخت کے موٹے سے ٹہنے پر کسی شاخ کا تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ جب پانی برستا سبزہ پھبکتا، لہلہاتا کوئل کوکتی پھرتی، پپیہا پی کہاں کا نعرہ بلند کرتا۔ طوطوں کے جھنڈ ٹیں ٹیں کا شور مچاتے ہوئے آموں کے درختوں پر بے تحاشا گرتے، آم ٹپکتے۔ میں شانے پر لاٹھی[2] رکھے ہوئے متوالوں کی طرح کبھی اس روش پر گھومتا کبھی اس روش پر۔ باغ میں آموں کے رکھوالے پھوس کی منڈیا میں بیٹھے طوطوں، کوا اُڑانے کے لئے شور مچاتے۔ ان آوازوں کی گونج دیوانے کے لئے ہو کا کام کرتی تھی۔ یہ تھیں وہ پُرکیف فضائیں اور وہ ولولہ انگیز مناظر جو ایک مخفی طریقے سے طبیعت پر گہرا شاعرانہ رنگ چڑھا رہے تھے۔ اور جذبات میں جوش بھر رہے تھے۔

ایک طرف یہ کیفیتیں تھیں۔ دوسرا رنگ طبیعت کا عجیب و غریب تھا۔ بچپنے کی

---

[1] دس بیس دن کے لئے یوں کہ شوق پالنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مگر چڑیوں کی قید دیکھی نہیں جاتی تھی۔ [2] لاٹھی اس لئے پاس رہتی تھی کہ اس باغ میں سانپ بہت کثرت سے تھے اور کچھ دن مجھے سانپ مارنے کا شوق رہا۔ سانپ مارنے کے سلسلے میں ایک دن ایک عجیب صورت پیش آئی۔ ایک پٹڑی پر میں نے ایک سانپ دیکھا "ہروا" جو کوئی اٹھارہ بیس انچ لانبا ہوتا ہے۔ اسے مار دیا۔ اب جو نظر پڑی تو پچاسوں سانپ اسی قسم کے پٹڑی پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دونوں طرف دکھائی دئے۔ میں گھبرایا اور کودتا ہوا، سانپوں سے پاؤں بچاتا وہاں سے بھاگا۔ پیچھے پھر کے بھی نہ دیکھا۔ اس دن سے سانپ مارنے کا شوق چھوٹ گیا۔ مگر ضرورت کے وقت سانپ مارنے میں کبھی تامل نہ ہوا۔

جگر بریلوی

تو یاد نہیں۔ لڑکپن بالکل آئینہ ہے۔ ہوش کی نشوونما کے ساتھ افسردگی کو اپنی طبیعت میں ودیعت پایا۔ ایک پُراسرار غم کا بوجھ دل کو دبانے لگا۔ بارہ چودہ سال کی عمر سے یہ بات محسوس ہوئی۔ مغموم رہتا تھا۔ بلا کسی ظاہر سبب کے اکثر بے وجہ بے اختیار منہ سے آہ نکل جاتی تھی۔ ماحول دل شکن اور یاس انگیز نظر آنے لگا۔ جب کبھی خوش رنگ نئے کپڑے پہنتا عام لڑکوں کی طرح بجائے خوش ہونے کے اُداس ہو جاتا۔ یہ جامہ زیبی کچھ ہیچ سی نظر آتی تھی۔ نمود و نمائش کا سا احساس بھی تکلیف دیتا تھا جیسے کوئی مجھ پر ہنستا ہو۔ میلوں ٹھیلوں سے بھی عام لڑکوں کی طرح شوق نہ تھا۔ دُنیا اور اس کی رنگینیاں موہوم سی معلوم ہوتی تھیں۔ والد آنجہانی مجھے Stoic (رواقی) کہا کرتے تھے۔ عمر کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسی کیفیت دل و دماغ پر مسلط رہنے لگی جیسے کسی نامعلوم منزل کی طرف شانوں پر ایک بوجھ لادے ہوئے رواں دواں چلا جا رہا ہوں وہاں اس بوجھ سے سبکبار ہو جاؤں گا۔ نہ کسی کام میں دلی توجہ لگتی تھی نہ کسی کوشش میں استقلال تھا۔ دل سے پژمردگی کا بوجھ کبھی نہ ہٹتا تھا۔ اضطراری آہوں نے مدتوں پیچھا نہ چھوڑا۔ ادھر حالات کچھ ایسے رونما ہوئے کہ یہ خلقی افسردگی اور یاس انگیز رجحانات روز بروز ترقی کرتے گئے۔ والد آنجہانی کو اپنے بچوں کی تعلیم کی بے حد فکر رہتی تھی اور اگر ہم میں سے کسی کو وہ پڑھنے لکھنے سے جی چراتے دیکھتے بس غضب ہی ہو جاتا۔ لڑکپن میں پڑھنے سے بھاگتا کون نہیں۔ مارا تو انہوں نے ہم کو کبھی نہیں۔ مگر ان کے غصہ کا ڈر قہر تھا۔ یہ بھی میری پژمردگی کا ایک سبب تھا۔ جب ہوش آیا کہ خاندانی وجاہت ہم لوگوں میں کس قسم کی تعلیم چاہتی ہے تو یہ خیال ایک فرض عظیم کا احساس بن کر دامنگیر رہنے لگا۔ جب تعلیم ختم ہوئی بیکاری سوہان روح تھی کیونکہ شادی ہو چکی تھی۔ ایک بچی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

گھر پر سخت ادبار تھا۔ ۱۹۰۷ء میں مقدمہ ہار جانے کے بعد جب مصیبتوں کا نزول شروع ہوا، روز بروز جانکاہ تباہیاں بڑھتی گئیں تو میرے دل و دماغ پر ہر دم اُداسی غالب رہنے لگی۔ میں تنہائی پسند ہو گیا۔ اکثر صبح صبح آبادی سے باہر گھومنے نکل جاتا اور فکروں میں غوطے کھاتا دو دو تین تین میل چلا جاتا تھا۔ میدانوں کی فضا بڑی غمگسار، سکون آور اور دلنواز محسوس ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا چلے نکلو یا یہیں کسی سایہ دار درخت کے تلے بیٹھ رہو۔

سال دو سال گردش روزگار رہتی تو شاید کوئی مستقل اثر نہ چھوڑ جاتی یہاں تو مصیبتوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہونے آتا تھا۔ ایسی ایسی صعوبات اور شدائد کا سامنا رہا۔ ایسے ایسے تلخ گھونٹ پینا پڑے کہ روح تلملا تلملا اُٹھی۔ گیارہ بارہ سال تک یہی لیل و نہار رہے۔ خلقی افسردگی ہی کیا کم تھی یہ تلخیاں اور زہر ہو گئیں۔

یہ تھیں وہ گوناگوں کیفیتیں جو لڑکپن سے طبیعت پر اپنا رنگ چڑھا رہی تھیں۔ جب شادی ہوئی۔ اس رنگ میں نئے عنوان سے شدت پیدا ہو چلی۔ اسی شدت میں دفعتہً شاعری نے جنم لے لیا۔ یوں سمجھئے کہ جس طرح کسی پہاڑی مقام پر عرصہ تک پانی جمع ہوتا رہے اور دفعتہً آبشار بنکر پھوٹ نکلے بالکل اسی طرح ایک مصرع سے میری شاعری شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء میں ایک صبح تڑکے کے پلنگ پر آنکھ کھلتے ہی بے غور و فکر، بے اختیار یہ مصرع زبان پر آ گیا جیسے کوئی پھل پک کر ٹپک پڑے

ناوک غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو

مَیں چونکا، ماتھا ٹھنکا، فال بری نظر آئی، مگر کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ بہر حال پلنگ پر پڑے۔ پڑے ہی اسے مطلع کر لیا

ناوک غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو
اشک کی نذر دل و جان و جگر ہونے دو

رفتہ رفتہ سات آٹھ شعر اور ہو گئے۔ غزل ہو گئی۔ دو شعر یہ ہیں

مذہب عشق میں اظہار الم جائز ہے
کون کہتا ہے میری ان کو خبر ہونے دو
رنگ لائے گا تڑپنا یہ تمہارا اک دن
درد ہوتا ہے اگر دل میں جگر ہونے دو

اس غزل کے چند ہی دن بعد مجھے ایک نہایت تلخ واقعہ پیش آیا گویا مطلع اس کی فال تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا تھا۔ اس سب کی پہلی فال یہی مطلع تھا۔ اس مطلع کی طرح اور بھی میرے بہت سے اشعار آئیندہ واقعات زندگی کی فال ثابت ہوئے ہیں جن کی کچھ تشریح مَیں نے اپنی انگریزی کتاب مسٹریز آف مائی مائنڈ میں کی ہے۔ مندرجہ بالا مطلع کے بعد جو واقعہ پیش آیا یہ تھا۔

مجھ پر، میرے ایک بھائی پر اور والد آنجہانی پر عدالت دیوانی کے ایک چپڑاسی کی طرف سے عدالت فوجداری میں استغاثہ دائر ہوا کہ ہم لوگوں نے چپڑاسی کے ساتھ مزاحمت کی اور اسے زد و کوب کیا۔ استغاثہ غلط نہ تھا۔ چپڑاسی نے والد آنجہانی کو اشتعال دلایا۔ ان کا ہات اُٹھنا تھا کہ چپڑاسی پٹ گیا لیکن جس مقدمہ سے یہ شاخسانہ نکلا تھا وہ محض ہم لوگوں کی بدنامی اور اہانت کے لئے دائر کیا گیا تھا۔ یہ تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ مقدمہ ہمارے ایک خاص عزیز اور والد آنجہانی کے شاگرد نے دائر کیا تھا۔ استغاثے کی

Mysteries of My Mind

کارروائی اس خفیہ طریقے پر عمل میں لائی گئی کہ ہم لوگوں کو کچھ علم نہ ہو سکا۔
حتےٰ کہ ہم لوگوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو گئے۔ والد اگھمانی
اور بھائی صاحب پر تو وارنٹوں کی تعمیل ہو نہ سکی۔ مَیں کالج میں پڑھتا تھا
پولیس کانسٹبل نے میرے درجہ میں پہنچکر مجھے وارنٹ گرفتاری دکھایا میں
اس کے ساتھ ہولیا۔ اب "کنور صاحب" گرفتار ہو کر تھانے چلے۔ کوئی
ادھیڑ عمر کا لمبی کھچڑی داڑھی والا مسلمان کانسٹبل تھا۔ کہنے لگا۔ آپ شریف
خاندان ہیں یکہ لے آؤں! اس پر بیٹھ لیجئے۔ میرے دل نے کہا جو رسوائی
ہونی تھی ہو لی اب یکے میں کیا دھرا ہے؟ مَیں نے اسے جواب دیا:۔
"نا میں پیدل ہی چلوں گا"۔ کالج سے کوہاٹا پیر کی پولیس چوکی کم و بیش
دو میل ہو گی۔ آگے آگے کانسٹبل اور پیچھے پیچھے "کنور صاحب" ملزم بنے
ہوئے سر جھکائے قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ بازار سے نکلا تو معلوم
ہوتا تھا۔ دونوں جانب کے دکاندار مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ اس وقت
میرے دل و دماغ کی جو حالت تھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر قدم پر
دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔ تھانے
آ کر ایک کھرّی چارپائی پر صم و بکم بیٹھ گیا۔ وہاں کون اپنا تھا جس سے بات
کرنے کو منہ کھولا جاتا۔ کالج کی کتابیں پاس تھیں۔ اس وقت غم کی اس گہرائی
میں دل ڈوب رہا تھا جہاں بے حسی ہے۔ وقت کاٹنے کے لئے فارسی کی
کتاب ہات میں اٹھالی کہ ورق گردانی کروں۔ کتاب کھولتے ہی اس شعر پر نظر
پڑی۔

اگر آلودہ درماں نہ سازی درد را صائبؔ
ز بیماری ہماں تیمار دارے میشود پیدا

مَیں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس شعر میں اور میری موجودہ حالت میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے کہ میرے ایک عزیز تھانے کے سامنے سے گزرے مجھے وہاں دیکھ کر متعجب ہوتے ہوئے اندر چلے آئے۔ حالات معلوم کیئے۔ اور میری ضمانت کرلی۔ مجھے رہائی مل گئی۔ اب گھر کی طرف قدم نہ اُٹھتے تھے دل کہتا تھا کہیں ایسی جگہ منہ چھپا کے بھاگ چلیئے جہاں کوئی نہ ہو۔ جنگل میں بھی ٹھکانا خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے۔ میں گھر آیا اور ایک گوشے میں چپ چاپ پڑ رہا۔ اب عدالت میں پیشی کا خیال اور مقدمے کے انجام کے متعلق وسوسے دل کو کھائے جاتے تھے۔ معاملہ سنگین اور ہم لوگوں کی ناداری و بیچارگی کی حالت آخر عدالت کی حاضری کا دن بھی آیا۔ وہ بھی ایک آزمائش تھی۔ سماعت مقدمہ کے بعد حاکم کا فیصلہ سُنکر خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم سب کی جُرم سے صاف برأت ہوگئی۔

اس زمانے تک شاعرانہ جذبات میں ہیجان پیدا ہو چکا تھا جو کبھی کبھی اس قسم کے اشعار کی صورتوں میں نکلتا رہا۔ ایک مسدس کائستھوں کی حالت پر لکھا۔ کچھ متفرق اشعار اور غزلیں فارسی میں کہیں۔ ذیل کے فارسی شعر پر والد آنجہانی بہت خوش ہوئے۔ فرمایا پچاس روپیہ انعام۔ پانچ روپیہ موجود تھے۔ اسی وقت میرے ہات پر رکھ دیئے۔

ناکساں را جا دہد در چشم خود گردوں مدام
پایۂ کس را ز اوج عز و شاں انداختہ

شعر میں کوئی خاص بات نہیں۔ انعام سے میری صرف ہمت افزائی مقصود تھی کیونکہ عرفی کے معرکہ آرا قصیدے کی زمین میں طبع آزمائی کی گئی تھی۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ (عرفی)

اپنے تخلص دلؔ کی مناسبت سے جگرؔ تخلص تجویز فرمایا۔ لیکن ہدایت یہ بھی کی کہ تعلیم پوری ہو جانے سے پہلے اس شوق میں نہ پڑنا۔ روز بروز بڑھتا ہوا جوش رُک گیا۔ پھر بھی سال میں دو چار غزلیں ہو جاتی تھیں۔ بس دو چار ہی، بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد اس شوق کی تکمیل کے لئے پوری آزادی مل گئی۔ فرصت بھی تھی۔ شب و روز اردو، فارسی، انگریزی ادبیات کے مطالعے میں گزرنے لگے۔ کسی ادبی کتاب کا مطالعہ وہ فارسی ہو، اردو ہو، انگریزی ہو۔ بغیر لغت کی مدد کے نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں ملازمت کے سلسلے سے جلال آباد ضلع شاہجہانپور پہنچا۔ وہاں کم و بیش ایک سال قیام رہا۔ اس عرصے میں نہ کوئی ادبی کتاب دیکھنے کو نصیب ہوئی نہ کوئی متنفس ایسا ملا جس سے گھڑی دو گھڑی شعر و ادب کا چرچا رہتا۔ ہر روز ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گرہ کی کوئی چیز کھوتا چلا جا رہا ہوں۔ طبیعت غیر شاعرانہ ہو گئی۔ شوق کی چنگاری دب گئی۔ سب سے زیادہ کوفت اس خیال سے تھی کہ اب تو ایسے ہی کور دیہہ مقامات میں لیل و نہار گزرنا ہیں۔ غرض رفتہ رفتہ طبیعت پر ایسی بے دلی مسلط ہو گئی کہ ادبی مشاغل بالکل ترک ہو گئے۔ تقریباً دو سال تک یہی کیفیت رہی۔ شعر کہنے کی قطعی نوبت نہ آئی۔ گویا شاعری کی وہ ایک غیر فطری رو تھی کہ آئی اور نکل گئی۔ یہ خبر نہ تھی۔

رہ رہ کے بدلتی ہے کروٹ پہ جگرؔ کروٹ
جو موجِ دل اُٹھتی ہے معدوم نہیں ہوتی

اب جلال آباد سے کہیں اور پہنچا اور گھومتا پھرتا ۱۹۲۱ء کے اوائل میں تحصیل گنور ضلع بدایوں آیا۔ یہاں منشی محمد یعقوب ضیا بدایونی رجسٹرار قانونگو تھے۔ انہیں علمی مشغلوں سے دلچسپی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے مگر نعت میں۔ ان سے شعر و سخن کے چرچے رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑکی۔ قدرت نے ذیل کے واقعے کے پردے میں سمند ناز پہ تازیانہ لگایا۔ برسات کا ولولہ انگیز موسم، صبح کا سہانا وقت، ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے۔ کالی کالی بدلیوں اور سرسبز اشجار کے جھومنے کا سماں۔ میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے کے اونچے چھتنار ہرے بھرے پیپل کی ٹہنی پر بیٹھ کر پپیہے نے "پی کہاں" کا نعرہ بلند کیا۔ "پی کہاں" کی رٹ نے تڑپا دیا۔ سینے میں آگ لگا دی۔ ایک دم جوش آیا کہ پپیہے پر کچھ لکھوں ملازمت کے حوصلہ شکن تجربات نے اس جوش کا گلا گھونٹنا چاہا۔ قلم اٹھانے نہ دیا۔ میں نے اس خیال کو ٹال دیا۔ پپیہا ہے کہ "پی کہاں" کی رٹ لگائے ہے۔ بار بار دل میں طوفان اٹھتا ہے کہ کچھ لکھوں اور زبردستی دبا دیا جاتا ہے مگر چڑھتے ہوئے سیلاب اور بڑھتے ہوئے طوفان کا زور کس کے روکے رکا ہے۔ اسی کشمکش میں ایک مصرع زبان پر آ گیا۔

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آ کے کون؟

اسے اضطراری طور پر لکھ لیا۔ فوراً ہی اس پر قلم بھی پھر گیا۔ وہی اندیشہ حاوی و غالب کہ کہاں بندگی، بیچارگی خانہ بدوشی، اور کہاں شاعری۔ اس کے علاوہ یہ موضوع بھی ایک بحر ناپیدا کنار معلوم ہوا۔ قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ پپیہا تھا کہ کمبخت چپ ہی نہ ہوتا تھا۔ دل کو بھرمائے ہی جاتا تھا۔ پپیہا یا فرشتۂ غیب تھا کہ مجھے زبردستی شاعر بنا دینے آیا تھا۔ غرض عجیب کشمکش میں دو تین

بار یہ مصرع لکھا گیا اور قلم زد کیا گیا اسی کشاکش میں تین مصرعے اور ہو گئے اور بیت بھی۔

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آ کے کون؟
دیتا ہے آواز کس کو درد سے چلا کے کون؟
نالہ کش ہے فرقت دلبر کا صدمہ پا کے کون؟
"پی کہاں" رٹتا ہے تنہائی سے یوں گھبرا کے کون؟

کون خار دشت وحشت ہے پئے داماں ہوش؟
کس کی یہ آواز ہے غارت گر سامان ہوش؟

نئے دور کی نظم کی ابتدا ہوئی۔ کئی مہینے اس نظم پر صرف ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دل و دماغ پر پپیہا چھا گیا تھا اور ہر روز کچھ نہ کچھ نئی دولت مجھے دیتا تھا۔ صبح و شام اس کی آواز برابر آتی تھی۔ رات کو آنکھ کھل جاتی تو اسے بولتے ہوئے پاتا تھا۔ دورے پر جاتا تو میدانوں میں اسے چیختے چلاتے دیکھتا اور سنتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی غائبانہ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ غرض ہر روز نظم میں نیا اضافہ ہوتا گیا۔ ہوتے ہوتے چھتیس بند ہو گئے۔ شعر گوئی کا سلسلہ پھر چل نکلا۔ ادھر ملازمت کے تلخ تجربات نے جذبات و کیفیات قلب میں گوناگوں تغیرات پیدا کر کے شاعری کی روح کو بیدار کرنا شروع کر دیا۔

یہ روح میری غزل میں بالکل بے نقاب ہے۔ ۱۹۴۲ء میں اپنے بیٹے گنگا موہن رائے نامی کی وفات کے ساتھ ساتھ میں نے سمجھ لیا تھا کہ شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایک طولانی مسدس "کائستھ درپن" ہوا۔ کچھ رباعیاں بھی ہوتی رہیں۔ غزل کے لئے جان باقی نہیں تھی۔ طبیعت میں سناٹا تھا۔

امید سے غم میں بھی گرمی تھی اب دل کی بستی سُونی ہے
آہیں وہ راہیں بھول گئیں اشکوں نے امنڈنا چھوڑ دیا

۱۹۵۱ء کے موسم سرما میں دفعتہً دلی کیفیات میں کچھ جوش پیدا ہوا۔ مردہ جذبات میں جان سی پڑ گئی۔ بے اختیار پانسات غزلیں ہو گئیں پھر لب پر ایسی مہر لگی گویا کبھی نہ ٹوٹے گی۔ مگر قدرت کے کھیل کون سمجھتا ہے۔ ۱۹۵۲ء کے جاڑے شروع ہوتے ہی طبیعت میں ایک طوفان آگیا۔ وہ دریا چڑھا کہ روکے نہ رُکا۔ مکان[1] کے سامنے ایک فرانسیسی کی کوٹھی ہے اس کے چمن کے پھولوں نے آگ لگا دی۔ دل کا عالم ہی اور تھا۔ ایک نشہ تھا کہ متوالا کئے تھا۔ اشعار تھے کہ امنڈے چلے آتے تھے۔ کبھی اس روانی سے شعر نہیں کہے۔ چار پانچ مہینے میں بیس بائیس غزلیں ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ رو نکل گئی۔ مگر کچھ زمانے تک شعر ہوتے رہے۔ اب کہ ۱۹۵۷ء کا آخر ہے۔ صحت بالکل خراب ہو گئی ہے۔ مدتوں سے اعصابی امراض میں گرفتار چلا جاتا ہوں۔ چلنا پھرنا بھی دشوار ہو گیا ہے دماغی حالت اور بھی ابتر ہے۔ سوچنے کی قوت بھی زائل ہو رہی ہے۔ فکر سخن سے دماغ دُکھتا ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی یہ زور کرتی ہے۔ شعر ہوتے ہیں اس طرح کہ ایک آج ہو گیا۔ چار روز بعد دوسرا پھر چار چھ روز بعد اور۔

تلمذ صحت زبان کے اکثر اصول اور فن شعر کی بیشتر باریکیاں والد آنجہانی کی علمی صحبتوں میں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جب ذوق سخن بڑھا مطالعہ بھی روز بروز بڑھتا گیا۔ علم وادب کی بہت سی کتابیں اور بیشمار

---

[1] میرٹھ میں

اردو رسالے نظر سے گزرے۔ بڑے بڑے نامی گرامی اساتذہ سے مشورت سخن رہی۔ منشی سوہن لال حقیر شاہجہانپوری،[1] حضرت جلیل جانشین امیر مینائی، مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی، منشی احمد علی شوق قدوائی، مرزا واجد حسین یاس و یگانہ عظیم آبادی ان سب نے یکے بعد دیگرے ایک ایک دو دو منظومات پر اصلاح فرمائی۔ سب کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں لسان الہند مرزا محمد ہادی، عزیز لکھنوی مرحوم و مغفور کو مستقل طور پر چھ سات سال تک کلام دکھایا۔ اس کے بعد آپ علیل رہنے لگے اور میں نے زحمت اصلاح دینا بند کر دیا۔ آپ نے ساٹھ پینسٹھ غزلیں مع مختصر نظموں کے دیکھی ہوں گی جن میں قلم لگایا ہے مگر کہیں کہیں۔ آپ کے فیضان و اثر کی سپاس گزاری ممکن ہی نہیں۔

ہزاراں عقدہ چوں انگور در دل داشتم صائب
بیک پیمانۂ مے کرد ساقی حل مشکلہا

میں جتنا آپ کے علمی تبحر کا قایل تھا اتنا ہی آپ کی بے تعصبی کا گرویدہ۔ ثبوت میں آپ کے خط کی ایک مختصر سی عبارت نقل کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں: "آپ کی نظم[2] پر تنقید کسی صاحب نے رسالہ نگار میں لکھی ہے۔ غالباً وہ مضمون آپ نے دیکھا ہو گا۔ نہایت ہی لغو اور مذہبی تعصب پر اس کی بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ اڈیٹر نے نوٹ لکھا تھا کہ شوق قدوائی کی نظم "عالم خیال" کے ہم پایہ ہے اس لئے ان کو ناگوار ہوا۔"

---

[1] فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان طبع ہو چکا ہے۔
[2] نظم "انتظار" جو رسالہ نگار میں سنہ ۱۹۲۶ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی
جگر بریلوی

اشعار اور فال مَیں نے اُوپر کہا ہے کہ میرے اکثر اشعار آیندہ واقعات کی فال ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض واقعات بہت اہم تھے۔ دوسرے شعرا کے اشعار نے بھی پیشینگوئیاں کی ہیں۔ یہاں صرف اپنے دو چار شعر لیتا ہوں۔ ان کا ذکر میرے متعلقات شاعری کا ایک انوکھا جزو بن جاتا ہے۔

جس مصرع سے شاعری کی ابتدا ہوئی اور جو تلخ واقعہ اس کے بعد پیش آیا سپرد قلم ہو چکا ہے۔ وہ ۱۹۱۵ء کی بات تھی۔ ۱۹۱۶ء میں غزل کا ایک شعر ہوا:۔

کیا خرابی ہے کہ وحشت میں چلے ہم سُوئے دشت
گھر کا افسوس نہ یاد آیا بیاباں ہونا

مَیں ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے میں ناکامیاب ہو چکا تھا۔ دوبارہ سلسلہ تعلیم جاری رکھنا میرے لئے محال تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھنے کی صورت نکال لی گئی۔ والد آنجہانی کی اس زمانے میں جو حالت تھی بار بار لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہر روز قرض مدوام کے لئے مجبور ہوتے تھے۔ ایک پرونوٹ پر کچھ روپیہ قرض لیا گیا۔ روپیہ دینے والے نے میرے دستخط بھی اس پر لے لئے۔ روپیہ ادا نہ ہو سکا۔ اس نے نالش کر دی۔ اور ہم لوگوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کرایا۔ مَیں گرفتاری کا مزا چکھ چکا تھا گھر میں چھُپ کر بیٹھ گیا۔ امتحان کا زمانہ قریب آ رہا تھا۔ پورا ایک مہینہ جب ہو گیا تو پرنسپل صاحب کا خط والد آنجہانی کے نام آیا کہ آپ کے لڑکے کی حاضریاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے امتحان میں شریک ہونے کے امکانات خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ اب میری پریشانی کی حالت

نہ پوچھیئے۔ وہی اندازہ کر سکتا ہے جس پر گزری ہو۔ نہ جانے کن مشکلوں سے یہ دن آیا تھا کہ امتحان میں شریک ہو سکتا۔ سو یہ افتاد سامنے آئی۔ اب کیا ہو۔ اپنا ہی شعر پڑھتا تھا اور آپ ہی پر برہم ہوتا تھا۔

۱۹۲۲ء میں ایک مطلع ہوا۔

ذرے[1] ذرے سے لیا داغ ہے رسوائی کا
کیا کلیجا ہے ترے حسن کے شیدائی کا

اس سے تین واقعات اور تینوں سخت و شدید یادگار ہیں۔ سب سے پہلا پہلے بیٹے کی موت تھی جو ولادت کے ایک ماہ بعد واقع ہوئی۔ دوسرے میں کلکٹر مسٹر نیدر سول سے سابقہ پڑا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملازمت میں ترقی ختم ہو گئی۔ تیسرا ایک حادثہ تھا جس سے خدا جانے کیونکر میری جان سلامت بچ گئی۔ یہ سب میری انگریزی سوانح عمری میں مفصل درج ہے۔ ۱۹۲۵ء میں یہ شعر ہوا تھا۔

یار منزل پہ جگہ جا پہنچے دو قدم تم نہ جگہ سے سرکے

جس جگہ سے ملازمت شروع کی تھی وہیں ختم کی۔

اب یہ شعر دیکھیئے اس میں جس روح فرسا سانحہ کی خبر ہے غور کیجیے۔

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے وہ رنگ ہے آج
جیسے جاتا ہو چھڑائے ہوئے داماں کوئی

یہ شعر آخر نومبر یا شروع دسمبر ۱۹۴۲ء میں ہوا تھا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کی صبح جب میرے نوجوان بیٹے کی میت اٹھائی جا رہی تھی یہ شعر میرے دل و دماغ

---

[1] اس کا پہلا مصرع حضرت استاذی عزیز لکھنوی آنجہانی نے یوں بنا دیا تھا:۔ جلوہ دل کھول کے دیکھا ہے خود آرائی کا

جگر بریلوی

میں گونج گونج کر رگ و ریشہ میں لرزہ پیدا کر رہا تھا۔

اس شعر کی الہامی صداقت سے زیادہ حیرت انگیز میری مثنوی "پیام ساوتری" کا وہ موقع ہے جہاں ستیہ وان کو موت آتی ہے۔ ستیہ وان کی موت کے وقت ساوتری اس کی بیوی جنگل میں اکیلی تھی۔ مَیں بھی نامی کے بستر مرگ پر اکیلا تھا۔ موت کا وقت بھی ایک ہی تھا یعنی رات کا پچھلا پہر۔ ستیہ وان کی عمر انیس سال کی تھی۔ نامی کی بھی یہی عمر تھی۔ مرض الموت بھی ایک ہی تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ جو لفظ دم آخر ستیہ وان کی زبان سے نکلے وہی نامی کی زبان پر تھے۔ ستیہ وان۔

چلّایا ارے پھٹا میرا سر

نامی بھی یہ کہکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ "بہت سخت درد ہے میرا سر پھٹا جاتا ہے"

راز یہ کھلا کہ مَیں نے یہ مثنوی نہیں لکھی بلکہ قدرت نے ستیہ وان کی موت کے پردے میں میرے ہی لختِ دل کی موت کا واقعہ پندرہ سولہ سال پہلے مجھ سے بیان کرا دیا تھا۔ اس بچے کی وفات سے چند روز پہلے ایک مطلع کہا تھا

کچھ فکر نہ کر تدبیر نہ کر تدبیر سے ہمدم کیا ہوگا!
جو سانس لئے سے بڑھتا ہے وہ درد بھلا کم کیا ہوگا!

اس کی وفات کے چند دن بعد پانچ شعر اس زمین میں اور ہوئے۔ غزل پوری ہوگئی۔ ان میں ایک شعر ہے

سینے میں آگ دہکتی ہے لب پیاس سے سُوکھے جاتے ہیں
جو قطرے چلّو بھر بھی نہیں ان سے اے شبنم کیا ہوگا!

اس آگ سے مراد وہ بے چینیاں تھیں جن میں میری زندگی نامی کی رحلت کے بعد گزری۔ پیاس سے مراد وہ شدید حاجتیں جو اہل و عیال کی پرورش کے باعث روز بروز لاحق رہ کر جان ضیق میں ڈالے رہیں۔ چلّو بھر قطروں سے وہ چند گلٹی کے سکے" جن پر معاش منحصر ہوئی تھی۔

شعر کہنے کا طریقہ شعر کہنے کے لئے کاغذ، قلم دوات لیکر بیٹھا ہوں مگر مسلسل نظم کے لئے زیادہ غزل کے لئے کم ابتدا میں تو کچھ دنوں یہ طریقہ ضرور رہا پھر رفتہ رفتہ چھوٹ گیا۔ قافیوں کو کاغذ پر لکھ کر ان پر خیال آرائی کبھی نہیں کی۔ اس طریقے سے ایک گونہ نفرت رہی۔ جو کچھ سوچا سمجھا اور محسوس کیا وہی لکھا یا جب کسی واقعہ یا مشاہدے یا زندگی کے تجربے سے متاثر ہوا ہوں فوراً شعر کہہ لیا ہے اور دماغ میں محفوظ رکھا ہے یا کاغذ پر لکھ لیا ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً تخیلات اور تاثرات اور مشاہدات داخلی و خارجی کے تابع اسی زمین میں چند شعر اور کہہ لئے۔ غزل ہو گئی ہو گئی نہ ہوئی نہ ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جذبات کی شدت میں خود بخود کوئی مصرع زبان پر آگیا۔ اسے فوراً شعر کر لیا۔ رفتہ رفتہ ایک، ایک دو دو اشعار اس میں اضافہ ہوتے رہے۔ ایک ہی غزل میں کہیں کہیں متضاد مضامین نظم ہو جانے کی یہی وجہ ہے کہ ایک وقت اور ایک حالت میں غزل بہت کم پوری ہوئی ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ کوئی شعر آج ہو گیا۔ بیاض میں لکھ لیا۔ مدتوں بعد اسی زمین کی طرف طبیعت پھر رجوع ہو گئی۔ ایسے دو مطلعے اس وقت یاد ہیں۔ ۱۹۲۳ء کے ہیں:-

اب تک جو دیکھتے تھے وہ دیکھا تو خواب تھا
دریا سمجھ رہے تھے جسے ہم سراب تھا

جلوہ دل کھول کے دیکھا ہے خود آرائی کا
کیا کلیجہ ہے تیرے حُسن کے شیدائی کا

پہلے پر غزل ۱۹۲۹ء میں ہوئی اور دوسرے پر ۱۹۲۴ء میں۔

مدت شعر گوئی دیکھتے ہوئے غزلوں کا مجموعہ بہت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ رسماً و رواجاً شعر نہیں کہا۔ اس ارادے سے شعر کم کہا کہ غزل لکھنا ہے یا دیوان مرتب کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی غزل بے مطلع ہوگئی۔ کوئی بے مقطع رہ گئی۔ غرض جب جذبات موجزن ہوئے اور طبیعت نے بھی شعر کہنے پر آمادگی ظاہر کی شعر کہا ورنہ نہیں۔ یعنی آمد کے ساتھ شعر ہوئے۔ اس کے رکتے ہی رک گئے۔ خواہ مخواہ دماغ پر زور دیکر غزل کبھی نہیں کہی قدرت نے یہ ایسی سخت پابندی دل و دماغ پر لگا دی ہے جسے ہزار توڑنا چاہوں نہیں ٹوٹتی۔ اس کے باعث اکثر عزیز و احباب کی فرمائشیں کہ غزل کہہ دو، کبھی پوری نہ ہو سکیں۔ ان کی دل شکنی کا خطاوار ہونا پڑا۔ غرور کا الزام مزید برآں آیا۔

عام مذاق سے شروع ہی سے نفرت رہی۔ ابتدا میں طبیعت بہت دشوار پسند تھی۔ ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج میں پنڈت جیوا رام کول ایم۔ اے کشمیری برہمن فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ جوان العمر، خوش رُو، خوش وضع، خوش اخلاق پروفیسر تھے۔ انہوں نے کالج کی لٹریری سوسائٹی کی از سر نو تنظیم کی۔ گویا اس میں نئی روح پھونکی۔ اس کی نشستوں میں مہینے میں ایک بار مشاعرہ بھی منعقد ہوتا تھا۔ ایک دفعہ غالب کا یہ مصرع طرح ہوا

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

خبط یہ سوار ہوا کہ غزل ہو تو غالب کے رنگ میں ہو۔ غور و فکر

شروع کیا۔ مشق سخن بالکل نہ تھی نہیں۔ خیالات بلند اور نازک پیدا ہوتے تھے جس کا نظم کرنا آسان نہ تھا۔ آخر بیس پچیس روز کی کاوش کے بعد نو دس شعر ہوئے۔

تھا غضب دشمن جاں درد کا درماں ہونا
ہو گیا زہر مسیحا کا پشیمان ہونا
نذر بے تابیٔ دل غیرت لیلےٰ نہ ہوئی
کیا ہوا خاک ہوا قیس بیاباں ہونا
کیا خرابی ہے کہ وحشت میں چلے ہم سوئے دشت
گھر کا افسوس نہ یاد آیا بیاباں ہونا
تا بلب حرف تمنّا کا ہے آنا دشوار!
ورنہ مشکل نہیں مشکل میری آساں ہونا!
کس سے ہو سکتا ہے دُنیا میں جگرؔ اس کا علاج
جس کی قسمت ہو ہر رنگ پریشاں ہونا

ایک مولانا والد آنجہانی کے معتقدین میں سے تھے۔ ایک روز وہ آئے میں نے انہیں غزل سنائی۔ اتفاق سے اسی وقت والد آنجہانی گھر سے باہر تشریف لے آئے۔ مولانا نے اس تمہید کے ساتھ کہ کچھ نئے شعر سنے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے گا۔ دو تین شعر ان کو سُنا دیے۔ انہوں نے فرمایا۔ یہ دُوسرے غالبؔ کون پیدا ہو گئے؟ میں پھولا نہ سمایا۔ کیونکہ غالبؔ کا آوازہ بہت تھا۔ اب تو بعض حلقوں میں غالبؔ کی پرستش ایک طرۂ امتیاز ہو گیا ہے۔ غالبؔ میرا مطمح نظر ہونے لگا۔ لیکن شکر کا مقام ہے کہ ذوق سلیم نے غالبؔ کی بے راہ رویوں سے بھی آگاہ کر دیا اور مقلد یا نقال کہلائے جانے سے

بچا لیا۔ کلام غالب پر جو غائر نظر ڈالی تو تھوڑے سے اشعار ایسے نظر آئے جن میں اس کے صاحبِ طرز ہونے اور اس کی عظمت کا راز ہے ورنہ اکثر و بیشتر اس کی پُرشکوہ فارسی ترکیبوں میں بجز کوہ کندن و کاہ برآوردن کچھ نہ پایا۔ دوسرا کوئی شاعر مطمحِ نظر نہ بنا میں اپنی ہی طبیعت کی رہبری پر چلنے لگا۔

اسرارِ محبت سے آگاہ میرا دل تھا
جو درد تھا رہبر تھا جو زخم تھا منزل تھا

غزل کہنے کی روش یہ رہی ہے کہ جب طبیعت موزوں ہوئی اور تاثرات نے ہجوم کیا۔ کسی کشادہ جگہ میں اگر سامنے ہوئے تو سرسبز درختوں کے نیچے[1] زیادہ تر صبح کے وقت ٹہلنے لگا ہوں۔ فکر کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھتے پڑتے ہیں۔ گویا خیالات کی نزاکت و تسلسل کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس سے ہم آہنگی کر رہے ہیں۔ فکر میں جتنی طبیعت ڈوبتی جاتی ہے۔ قدم آہستہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی ساکت سا استادہ رہ جاتا ہوں۔ تاثرات و خیالات کے اعتبار سے قافیئے ذہن میں آتے ہیں۔ کبھی مصرعِ اولیٰ پہلے ہو جاتا ہے کبھی مصرعِ ثانی۔ اشعار کو دماغ میں محفوظ کرتا جاتا ہوں۔ فکرِ شعر ختم ہو جانے کے بعد فرصت کے وقت یہ اشعار قلمبند کر لیتا ہوں۔ صبح اٹھنے کا عادی ہوں۔ اکثر تڑکے سے بہت پہلے آنکھ کھل گئی ہے تو بستر چھوڑتے وقت تک شعر ہی کہے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو نیند نہیں آئی ہے تو پڑے پڑے شعر ہی کہے ہیں۔ ایسے ہی وقت کا ایک مطلع ہے :۔

---

[1] بریلی کے سوا جہاں جہاں میں رہا زیادہ تر ایسی ہی جگہیں میسر ہوتی رہی ہیں۔ اب میرٹھ میں بھی ایسی ہی جگہ مکان ہے۔ چاروں طرف ہرے بھرے درخت ہیں۔
جگر بریلوی

نیند کے بدلے تسلی ہی سہی آتی تو ہے
دل سے باتیں کرتے کرتے رات کٹ جاتی تو ہے

دورانِ سفر میں بہت شعر کہے ہیں۔ ریل کے سفر میں نہیں بلکہ کارِ منصبی کی انجام دہی کے سلسلہ میں جب دور دست دیہات میں جانا ہوتا ہے۔ جب رہلو یا لمبی بیل گاڑی میں لد کر میدانوں کی سرسبز اور کیف آور فضاؤں میں یا گرم تپتے ہوئے ناہموار اونچے نیچے راستوں میں خسرو کے کھا کھا کے چند گھنٹوں کا سفر دن بھر میں طے کیا ہے تو یا کتب بینی کی ہے یا شعر کہے ہیں سنئے:۔

کیا فائدہ رونے دھونے سے جب اس کا کچھ حاصل ہی نہیں
کیا درد سنائیں اپنا ہم سینے میں تمہارے دل ہی نہیں
جنگل سے گائیں گھر کو چلیں چڑیاں بھی بسیرا لینے لگیں
مَیں کیسا مسافر ہوں یارب اُف میری کہیں منزل ہی نہیں

اس غزل کی فکر میں دن تمام ہوا۔ ایک گاؤں میں قیام ہوا۔ رات آئی مگر آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

ہے آدھی رات کا سناٹا اور ساری دُنیا سوتی ہے
کیا کہئے اپنی آنکھوں کو سونے پہ ذرا مایل ہی نہیں

ایک سفر ان اشعار کے ساتھ ختم ہوا:۔

یارب اس رنج و غربت کا ہوگا بھی انجام کہیں!
در در مارے مارے پھرنا صبح کہیں اور شام کہیں!
رنج اسیری خود دوزخ ہے سو لطف صیاد کبھی
سونے کا ہی کیوں نہ قفس ہو ملتا ہے آرام کہیں!

ایک گاؤں کے قیام کا شعر ہے :-

شبِ تاریک ہے ویرانہ ہے محویت غم ہے
عجب عالم میں قربت آپ کی محسوس ہوتی ہے

میرے شعر کہنے کا یہی ڈھنگ رہا ہے۔ مسلسل نظم کے بھی بعض اوقات دس دس پندرہ پندرہ شعر اسی طرح کہہ لئے۔ بعد کو قلمبند کئے۔ چند اشعار مکمل ہو جانے کے بعد نظر ثانی شروع کرتا ہوں اور نہایت سختی سے اس وقت تک کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں جب تک میرا صحیح صحیح مفہوم وہ پیرایہ اظہار اختیار نہیں کر لیتا جو میں چاہتا ہوں۔ مرصع سازی پر معنی کو کبھی قربان نہیں کرتا۔ کمال فن دکھانے کے لئے کبھی شعر نہیں کہتا۔ زبان و بیان کے اصولوں کا سختی کے ساتھ پابند ہوں لیکن لکیر کا فقیر بھی نہیں۔ مشاہدات و واقعات سے کس طرح شعر کہتا ہوں سنیئے۔ میں تحصیل گنور ضلع بدایوں میں تھا۔ مکان کا صدر دروازہ کچا تھا۔ کواڑہ کی چول میں لال بھڑوں نے چھتہ رکھا مجھے اس کے کاٹنے سے سخت تکلیف ہو جاتی ہے۔ دو تین دن تک چارپائی سے اُٹھا نہیں جاتا۔ ادھر دو ایک آنے جانیوالوں کو انہوں نے کاٹا بھی۔ آخر چھتہ بند کرانا پڑا۔ اس میں گوبر اور مٹی خوب تھوپ دی گئی۔ کچھ مٹی ادھر اُدھر دروازے کے سامنے بکھری پڑی تھی۔ باہر سے بھڑیں آتی تھیں۔ اور چھتے کی جگہ سر ٹکرا کر چلی جاتی تھیں۔ میں نے اتنے میں دیکھا کہ ایک بھڑ اُڑتے اُڑتے چکر کاٹ کر زمین پر بیٹھی اور منہ میں کچھ لیکر غالباً گیلی مٹی لیکر چھتے کی طرف اُڑی۔ معاً تخیل کو تحریک ہوئی۔ یہ شعر موزوں ہو گیا :-

پھر عندلیب زار نے تنکے اُٹھا لئے
شاید چمن اُجڑنے کی اس کو خبر نہیں

ایک مرتبہ میں مجسٹریٹ درجہ اوّل کے اجلاس میں بیٹھا تھا۔ کانگریسی جاں نثاروں کے مقدمات پیش تھے۔ نمک بنانے کا الزام تھا۔ پولیس نے چالان کیا تھا۔ یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب مہاتما گاندھی مشہور ڈانڈی یاترا میں گرفتار ہوئے تھے۔ نمک سازی کی تحریک زوروں پر تھی مجسٹریٹ کے روبرو ملزم آتے۔ جُرم سے اقبال اور صفائی دینے سے انکار کرتے۔ سزا کا حکم سُنتے اور خوش خوش سر جھکائے عدالت سے باہر چلے جاتے تھے۔ اس وقت یہ شعر موزوں ہوُا:-

جس پہ رنگینیٔ عالم کی بنا قائم ہے
غور سے کی جو نظر خونِ شہیداں نکلا

مَیں اکبر پور ضلع کانپور میں تھا۔ سید احمد علی جو بعد کو خان بہادر اور کلکٹر ہو گئے تھے۔ میرے حاکم پرگنہ تھے۔ مجھ پر مہربان تھے۔ ایک روز ان کے در دولت پر حاضر ہوُا تو فرمانے لگے۔ آپ نے اپنا کیرکٹر رول دیکھ لیا؟ لب پر ہلکا سا تبسّم اور نگاہ میں بندہ نوازی کی جھلک تھی۔ مَیں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا دیکھیے گا۔ مَیں نے کہا اچھا۔ جب مَیں نے اپنا کیرکٹر رول دیکھا تو اس میں صرف یہ لکھا تھا۔ "حاکم پرگنہ کہتے ہیں۔ کہ نائب تحصیلدار کا کام قابل اطمینان[1] ہے"۔ دل میں مجھے ہنسی آئی۔ کہ جگر یہ تجھے کیا جانیں کیا سمجھیں۔ ساتھ ہی ساتھ تخیل کو تحریک ہوئی۔ فکر نے کچھ دیر بعد طبیعت کا رخ یوں پیش کیا۔

گدا سمجھ کے جہاں اس نے مجھکو بخش دیا
مگر مَیں چُپ ہوں کہ انکار ناگوار نہ ہو

---

[1] یہ اندراجات کلکٹر کرتے ہیں۔

باب چہارم

کچھ غیر معمولی سی باتیں

ایک رُخ میری زندگی کا بالکل پُراسرار رہا ہے۔ مدت تک میں نے اسے ایک مقدس راز سمجھا۔ کبھی زبان پر نہ آنے دیا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں محسوس ہُوا کہ اس راز کا اب انکشاف ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ "مسٹریز آف مائی مائنڈ" کے نام سے ایک کتاب تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کی بزبان انگریزی لکھ ڈالی۔ یہاں ان اوراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن تمام موضوعات کا ذکر کیا جائے جن پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ صرف اتنا ذکر کر دینا نہایت اہم اور لازمی بھٹرتا ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے مجھے پُراسرار تجربات پیش آنے لگے مثلاً خوابوں کا سچا ہونا، اشعار کے ذریعے پیشنگوئیاں ہونا۔ غیبی آوازوں سے آئندہ واقعات کی آگاہیاں ہو جانا۔ زندگی کا کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے۔ جس کا علم کسی نہ کسی ذریعہ سے پہلے سے نہ ہو گیا ہو۔ دوسری طرف نفسیاتی قوتوں کی کارفرمائی بھی کم حیرت انگیز نہیں رہی۔ جو خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ اس کے برعکس ظہور میں آیا۔ دولت و ثروت یا ساز و سامان عشرت کی طرف کبھی خیال بھی نہیں گیا۔ راحت کی تمنا ضرور ہوئی۔ بس انگاروں پر لوٹنے لگا۔ کسی پھول یا پودے کو دیکھ کر خوش ہُوا تو وہ جھلس کر رہ گیا۔ خاک میں مل گیا۔ کبھی

کوئی ارادہ پورا نہ ہوا - امیدوں نے زہر کے گھونٹ حلق سے نیچے اتار
دیے - سب سے زیادہ تقویت کی امیدیں ناکامی سے وابستہ تھیں - سو سب
سے پہلے اسی کو قضا نے چھانٹا اور عنفوانِ شباب میں - اسی طرح خیالات
کے نتائج بالکل اُلٹے نکلے - کسی معاملے میں کوئی تدبیر یا انتظام نہ بن
پڑا - اگر بن پڑا تو راس نہ آیا - اسی قسم کی اور بہت سی خصوصیات ہیں - جو
باہم دگر نہایت مسلسل و مربوط ہیں - میری زندگی انہیں سے عبارت
ہے - انہیں میں وہ روحانی تڑپ بھی ہے جس نے دنیا اور اسباب دنیا سے
بے نیاز بنائے رکھا اور کبھی کبھی اس جھلک سے ہمکنار کر دیا جس کا حظ
و انبساط کیف و سرور بیان سے باہر ہے -

کچھ غیر شاعرانہ سی باتیں

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ شراب و شعر گوئی میں کوئی خاص رشتہ ہے -
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شراب پی کر شاعر کی طبیعت موجیں مارنے لگتی ہے -
میں سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء تک شراب[1] پیتا رہا - عادت نہیں تھی - اکثر موسم سرما میں

[1] مہاتما گاندھی کی تحریک نمک سازی کا زور تھا - ملک میں سیاسی شورش برپا تھی -
شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہوتا تھا - پولیس کی لاٹھیاں عام تھیں - کہیں کہیں گولیاں بھی چلتی
تھیں - میرے گھر میں روز یہی چرچے رہتے - ایک شام میں کھانے پر بیٹھا - بچے ساتھ بیٹھے
تھے - شیشے کے گلاس میں تھوڑا سا بادہ زرنگ ڈال کر اسے سوڈا واٹر سے بھر دیا کہ لطف
لے لے کر پیوں گا - میں نے گلاس ہاتھ میں اٹھایا ہی تھا کہ میرا مرحوم بچہ جس کی عمر اس وقت پانچ

پیتا تھا۔لیکن شراب سے مجھ میں کبھی شاعرانہ جولانی پیدا نہیں ہوئی بلکہ طبیعت کند اور دماغ ٹھس ہو جاتا تھا۔اگر شعر کہنا بھی چاہتا تھا تو نہ کہہ سکتا تھا۔

شاعر اپنا تازہ کلام جب تک کسی کو سُنا نہیں لیتا اسے چین نہیں پڑتا۔ اکثر شاعروں کو اس کا مرض ہوتا ہے۔ابتدا میں تو دس بارہ سال تک اتنا ضرور رہا کہ جب میں کوئی نئی نظم یا غزل کہتا تو دل چاہتا تھا کہ کوئی اسے سُنے جائے اور میں سُنائے جاؤں۔لیکن رفتہ رفتہ یہ خواہش ترک ہوگئی۔ مجھے اپنا شعر سنانے میں پس و پیش ہونے لگا۔ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر کسی شاعر کا کلام تفریحاً سُنا جائے تو یہ اس کی توہین ہے۔رفتہ رفتہ شاعری مجھ پر روحانیت کا اثر ڈالنے لگی۔میں کلام سُننے والے میں یہ دیکھنے لگا کہ اس کے دل میں شاعری کی کچھ عظمت ہے یا اسے محض تفنّنِ طبع کا مشغلہ سمجھتا ہے؟ اگر سننے والے کے دل میں شاعری کی عظمت میں نے پائی اسے دل کھول کر اپنا کلام سُنایا ورنہ ہرگز نہیں۔لاکھ فرمائش کسی نے کی ہمیشہ ٹال دیا۔ملازمت کے زمانے میں بعض حاکم میرا کلام سننے کے متمنی ہوتے تھے مگر میں نے اپنی روش سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ان کی خوشنودی یا سرگرانی کی کبھی پروا نہ کی۔جب کبھی شاعری کی عظمت کو سمجھنے والے چند سخن فہموں کی صحبت نصیب ہوگئی۔اسے خاص نعمت سمجھا مگر ایسے مواقع کم نصیب ہوئے۔

مشاعروں کی شرکت سے کچھ خلقی طور پر پرہیز رہا۔ان صحبتوں میں اپنے کو

(فٹ نوٹ بقیہ صفحہ ۵۵) چھ برس کی تھی کہنے لگا۔"پاپا جی! آپ اسے پی رہے ہیں؟ اس کے پیچھے آج کل بچے تک گولیاں کھا رہے ہیں"۔میں نے فوراً گلاس فرش پر رکھ دیا اور ہمیشہ کے لئے۔ یارانِ رندمشرب کو جب معلوم ہوا تو بہت بگڑے۔دو چار بار زبردستی پلا دینے کی کوشش کی مگر نہ چلی۔دنیا بھر کے پنڈت جس کی اصلاح نہ کر سکتے تھے ایک بچے نے اسے پارسا بنا دیا۔

جگر بریلوی

اجنبی سا محسوس کرتا ہوں۔ اب تک چھ سات مشاعروں میں شرکت کی نوبت آئی ہوگی وہ بھی کسی مجبوری سے۔ خواہ مخواہ کی واہ وا اور سبحان اللہ کو میں شاعری کا حاصل یا شاعر کا صلہ یا اس کے کلام پر تنقید نہیں سمجھتا۔ شعر و سخن میں ایک روحانی لذت ہے جس کے آگے دنیا کی تمام لذتیں ہیچ ہیں۔ یہی لذت شاعرانہ زندگی کا حاصل ہے۔ ہنگامہ آرائی سے اور اس سے کیا واسطہ۔ میں تخلیے کی صحبتوں کا دلدادہ رہا ہوں۔ شاگردوں کا لشکر تیار کرنے سے بھی عار رہا۔ ہاں جب کسی نے سچے دل سے مشورہ چاہا۔ میں نے دریغ نہ کیا۔ اور ایسے موقعے بہت آئے۔ اُستاد کا لفظ کچھ ایسے نازک فرائض ساتھ لئے ہوئے ہے جن کا ادا ہونا دشوار ہے۔ میں اپنے کو کسی کا استاد نہیں کہہ سکتا۔ ہاں بلحاظ مدت جناب سری دھر پرشاد نگم ناشاد ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر آٹھ دس سال مستقلاً مشورہ سخن کرتے رہے اور بہ لحاظ قرابت میرے داماد عزیز القدر راجیندر نرائن بسمل بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی اکثر منظومات دکھاتے رہتے ہیں۔ عزیز ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی نے شعر و ادب اور زبان و بیان کے متعلق اکثر زبانی درس لئے ہیں۔ کچھ مضامین بھی دکھائے ہیں۔

باب پنجم

تصنیفات

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ نثر لکھنے کا بھی شوق رہا۔ غالباً ۱۹۲۲ء کا آغاز تھا کہ میرے موسیرے بہنوئی رائے بہادر بابو بدری پرشاد مرحوم شاہجہانپور نے اپنی تالیف کردہ تاریخ ہند کو از سر نو لکھنے کی خدمت میرے سپرد کی۔ یہ تاریخ کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ ۱۹۲۶ء[1] میں اسے میں نے ختم کیا۔ یہ میری سب سے پہلی ادبی سعی تھی۔ ادھر اردو رسالوں کے لئے بھی مضامین لکھنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ کم و بیش بیس سال تک قائم رہا۔ یہ مضامین رسالہ "زمانہ" کانپور، "نیرنگ" دہلی میں شائع ہوتے رہے۔ تصنیفات و تالیفات کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

نثر۔ (۱) اردو اور ہنود حجم ڈیڑھ سو صفحات۔ اس کتاب میں ان خدمات کا ذکر ہے۔ جو ہندوؤں نے اردو کی ترویج و تشکیل اور اس کی ترقی و توسیع میں انجام دی ہیں اور ان تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے جو ہندو مذہب و معاشرت کے اعتبار سے اردو کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب پچاسوں کتابوں کے مطالعے اور مسلسل کئی سال کی تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ (غیر مطبوعہ)

[1] اس سے بہت پہلے دو افسانے بھی لکھے تھے۔

(۲) **یادِ رفتگاں** حجم تین سو چھ صفحات۔ متوفی ہندو مشاہیر شعرا و ادبا کے سوانح زندگی، انتخاباتِ کلام اور کلام پر تنقید و تبصرہ کا مجموعہ ہے۔ (مطبوعہ)

(۳) **بہارِ جاوداں** حجم تقریباً ساڑھے چار سَو صفحات۔ موجودہ ہندو مشاہیر شعرا و ادبا کے سوانح زندگی، انتخابات کلام اور کلام پر تنقید و تبصرہ کا مجموعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)

(۴) **یادگارِ نظر** حجم چار سو صفحات۔ منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی مرحوم کی مکمل سوانح عمری، انتخابات غزلیات و مضامین نظم و نثر اور نظرؔ کی ہر قسم کی تصنیف پر تنقید و تبصرہ کا مجموعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)

(۵) **متفرق ادبی مضامین** :- تین جلد

(۶) **ظریفانہ مضامین** حجم ڈیڑھ سَو صفحات۔ یہ مضامین زیادہ تر کایستھوں کی سوشل حالت کے متعلق ہیں۔

(۷) **مزاحیہ مضامین** حجم سَو صفحات

(۸) **صحتِ زبان** زبان اردو کے متعلق اسّی صفحات کا رسالہ ہے۔ جس میں بہت سے نکات صحت الفاظ و تراکیب کے متعلق حل کئے گئے ہیں۔ (مطبع نظامی بدایوں سے شائع ہوئی ہے)

(۹) **اسناد** اساتذہ اردو کے ان اشعار کا مجموعہ ہے جو بعض الفاظ کی صحت میں سند کا حکم رکھتے ہیں۔

(۱۰) **مکاتیبِ شمیم**۔ دو حصّہ۔ حجم تقریباً دو سَو صفحات۔

منشی منموہن لال ماتھر مرحوم ایڈووکیٹ بریلی کے نادر خطوط کا مجموعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)

(۱۱) **جدید تغزل** تمہیم غزل کا مختصر مگر مسلسل عروج و زوال۔ جدید غزل کی نشوونما، جدید غزل گویوں کا تذکرہ، ان کے کلام کا انتخاب، کلام پر تنقید و تبصرہ سب کچھ اس کتاب میں شامل ہے۔ پانسات سو صفحات تک حجم ہوگا۔ (زیرِ طبع)

نظم

(۱) **رازو نیاز** حجم ڈیڑھ سو صفحات۔ غزلیات کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۲) **نور و سرور** حجم ڈھائی سو صفحات، مختصر مثنویوں اور دیگر متفرق نظموں کا مجموعہ۔ (غیر مطبوعہ)

(۳) **پیام ساوتری** مثنوی ہے۔ اس میں چودہ سو اشعار ہیں۔ بظاہر ستیہ وان اور ساوتری کا افسانہ ہے معنیاً چند حقیقتوں پر بحث کی گئی ہے۔ جن میں عشق، عقیدت، یقین و عمل خاص خاص ہیں۔ (مطبوعہ)

(۴) **اسرار** کوئی سوا دو سو رباعیات کا مجموعہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)

(۵) **کلیاں** حجم چالیس صفحات۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مندرجہ بالا منظومات کے علاوہ کئی سو اشعار ایسی نظموں کے ہوں گے جو نامکمل رہ گئی ہیں یا جن کی نظرِ ثانی نہ ہو سکی۔ کم و بیش تمام غزلیات اور متفرق منظومات مختلف اردو رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے "نگار" لکھنؤ، "زمانہ" کانپور، "نیرنگ" دہلی اور "ہمایوں" لاہور خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بچوں کی اکثر و بیشتر

نظمیں ہندی رسالہ "بال سکھا" الہ آباد میں شائع ہو چکی ہیں۔ نظم "پپیہا اور پی کہاں"[۱]، اور "کایستھ درپن"[۲]، علیحدہ علیحدہ شائع ہوئی ہیں۔ تین مختصر مثنویوں کا ایک مجموعہ "رنگ و بو"[۳]، کے نام سے چھپا ہے۔ مستقل کتابوں میں سے "یادِ رفتگاں"[۴]، شائع ہو چکی ہے اور افسوس ہے کہ بہت غلط شائع ہوئی ہے۔ کتابت کی صدہا غلطیاں ہیں۔ میں نے اس کا صحت نامہ مرتب کر کے پبلشر سید جلال الدین جعفری الہ آباد کے پاس بھیج دیا تھا لیکن کتاب میں شامل نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کیوں۔ "بہار جاوداں" اور "یادگار نظر" بھی اسی پبلشر نے طباعت کے لئے لے لی تھیں مگر ابھی تک نہیں چھپی ہیں۔ مثنوی "پیام ساوتری" میرے کرمفرما مسٹر سریدھر پرشاد ناشاد کی کوششوں سے طبع ہوئی اور مکتبہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر یو۔پی گورنمنٹ نے مجھے پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ ملک کے تمام چوٹی کے مشاہیر ادب نے اسے ایک شعری شاہکار اور قابل قدر اضافہ تسلیم کر لیا ہے۔ بہت سی رائیں اور ریویو اخباروں اور رسالوں میں نکل چکے ہیں۔

اہلِ نظر کی رائیں اکثر ادیبوں اور سخنوروں کے قلم سے کچھ کلمات میرے منظومات کے متعلق بے اختیار نکلتے رہے ہیں۔ ان حضرات میں عزیز لکھنوی اور آثر لکھنوی، اصغر گونڈوی، جوش ملیح آبادی، احسن مارہروی، سروش الہ آبادی، نیاز فتح پوری، ادیب[۵] بریلوی ایم۔اے اور دیگر

۱، ۲، ۳ ملنے کا پتہ:- شری ویریندر پرشاد سکسینہ۔ نئی سرائے بدایوں

۴ ملنے کا پتہ:- مطبع انوار احمدی ۲۸۷ شاہ گنج الہ آباد

۵ ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ایم۔اے۔ آپ کا ایک مستقل مضمون میری غزل پر نگار بابت ماہ اکتوبر ۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔

جگر بریلوی

نقادانِ سخن شامل ہیں۔ ان حضرات نے کیا لکھا ہے یہاں نقل کرنے کی ضرورت
نہیں۔ ذوق سلیم اور شعورِ سخن پر پوشیدہ نہ رہیگا کہ میری غزل اور نظم کی کیا حقیقت ہے

معاصرین سے موازنہ

مَیں نے اپنی غزل کے کچھ خط و خال خود ہی نمایاں
کیئے ہیں۔ مَیں نے کیوں ایسا کیا اور کس طریق پر؟
ان صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا۔ یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ میری غزل
گزشتہ اور موجودہ زمانے کی غزل سے علیحدہ چیز ہے۔ بالکل نیا وجدان پیش کرتی
ہے۔ اس کا رنگ روپ اس کی رُوح سب سے الگ ہے۔ کسی سے موازنہ
کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ شعر و ادب کی بساط بہت وسیع ہے اور بہت
رنگا رنگ جیسی انفرادیت میری غزل کی ہے۔ میرے بعض معاصرین کی
بھی ہے۔ موجودہ دور کے شعرا میں جگر مرادابادی ہی کو میرے
ہمعصروں میں سمجھنا چاہیئے۔ جگر مرادآبادی کا اور میرا سن ولادت بھی اتفاق
سے ایک ہی ہے۔ میرے اور ان کے تغزل میں کوئی مماثلت نہیں ہم دونوں
ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمت رُخ گئے ہوئے ہیں۔ ہاں فانیؔ سے کچھ
مماثلت ہے۔ فانیؔ کے یہاں حزن و یاس کے مضامین بہت ہیں۔ مجھے بھی غم و
ملال سے بہت سابقہ رہا ہے، مگر ہم دونوں کے حزن و ملال کی نوعیتوں میں فرق
ہے۔ اسلئے کہ تجربات زندگی مختلف ہیں اور مطمح نظر مختلف۔ اگر ہم تینوں سخن
گویوں کی دو دو چار چار ہم طرح غزلیں پیش بھی کر دی جائیں تو کچھ فائدہ نہیں بلکہ
اس سے ایک قسم کا مغالطہ پیدا ہو جائیگا۔

ہزار رنگ کے پہلو ادا و ناز میں ہیں
ہزار رنگ سے چمکیں گے جاں نثاران کے

حصّہ دوم

میری غزل

اپنی غزل پر مَیں نے قلم کیوں اُٹھایا؟

نسیم آئی تو کلیاں نہ رہ سکی کلیاں ۔۔۔ چٹک کے پھول بنیں زینتِ چمن کیلئے

جب مَیں نے اُردو کے معتبر رسالوں میں غزلیں بھیجنا شروع کیا تو چند ہی سال بعد چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بھرمار ہونے لگی۔ میرا سر پھرنے لگا۔ خواہش ہوئی کہ تحسین و آفرین کی یہ آوازیں تمام ملک میں گونجیں۔ کوئی میری غزل کو منظرِ عام پر لائے۔ دُنیا کو دکھائے کہ مَیں بھی کتنا بڑا صاحب کمال ہوں منفرد سخنور ہوں۔ نہیں سمجھ میں آتا تھا کہ یہ کس لئے اور کیوں؟ اس خواہش کو زمانے کی خود فروشی و خودستائی کی روِش نے اور بھی مشتعل کیا۔ بعض شعراء نے عارفانہ عجز و انکسار کا خرقہ پہنا مگر دوسروں کو خوب خوب ابھارا کہ ان کے متعلق طویل مضامین لکھیں۔ مضامین لکھے گئے۔ بعضوں نے خود اپنے متعلق قلم اُٹھایا اور اپنے کلام کو وحی و الہام سے بڑھ کر بتایا۔ ایک صاحب نے لکھا۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے خدا بول رہا ہے مَیں لکھ رہا ہوں۔ ان مثالوں نے میری خواہش کو خبط میں تبدیل کر دیا ایک صاحب کو لکھا بھی کہ میری منظومات پر کچھ لکھیں۔ انھوں نے اطمینان دلایا کہ لکھ رہے ہیں مگر ان کے مضامین نہ شائع ہوئے نہ مجھ تک پہنچے۔ خود بھی ایک دو مضمون اپنے کلام کے متعلق لکھے مگر حق یہ ہے کہ دل درپردہ ملامت ہی کرتا رہا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ خبط ٹھنڈا پڑ گیا اور یہ بھی سمجھ میں آتا گیا کہ تعلّیوں سے کوئی کسی معراج پر نہیں پہنچتا۔ ۱۹۳۳ء میں اپنے ایک دوست کی ترغیب سے اپنا مجموعہ غزلیات ڈاکٹر سعید[1] احمد صاحب سعید

---

[1] آپ مشہور ادیب ہیں اور کئی تصانیف کے مالک۔ جامعہ ملیہ دہلی سے وابستہ تھے۔ پاکستان میں انتقال ہوا۔

بریلوی کے پاس دہلی بھیجدیا کہ وہ مقدمہ لکھ دیں۔ انہیں فرصت نہ ہو سکی۔ دو چار سال تو میں نے تقاضے کئے۔ رفتہ رفتہ مقدمے کا خیال چھوڑ دیا کیونکہ خبط بہت کچھ ٹھنڈا پڑ چلا تھا۔ ابھی حال ہی میں وہ ایک سال سے زیادہ بریلی میں مقیم رہے۔ ملاقات بھی ہوا کی۔ تقاضے کا خیال بھی نہ آیا۔ مجموعہ بھی واپس نہ مانگا۔ بات ختم ہو گئی۔

اب اسے کوئی خود ستائی سمجھے یا اظہارِ حقیقت میری غزل میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو میری پُراسرار زندگی سے جسم و جان کی طرح وابستہ ہیں۔ میرا دل و دماغ ہی غزل میں حل نہیں ہو گیا ہے۔ میری زندگی اور رُوح بھی اسی میں کھنچ آئی ہے۔ دوسرے میری غزل کو سمجھ لیں مگر مجھے خیال ہوا کہ میری زندگی اور غزل کے رشتے کی طرف اشارہ ہوئے بغیر میرے دل و دماغ کی تمام تہوں تک نگاہیں نہ پہنچ سکیں گی اور وہ کیفیت نہ محسوس ہو سکے گی جو نہاں خانۂ رُوح میں مجھے محسوس ہوئی ہے اسی لئے ابھی تک اس خیال سے دامن نہ چھڑا سکا کہ میری غزل شائع ہو تو ایک روشن مقدمے کے ساتھ میری غزلیات زیادہ تر رسالۂ نگار میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے ایڈیٹر حضرت نیازؔ فتحپوری ان کے رنگ سے واقف ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں انہیں میں نے لکھا کہ میری خاطر یا ادب نوازی کی خاطر میری غزل پر آپ مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ انہیں اس لئے لکھا کہ میرا خیال ہے ان کی تحریر کو کوئی پراپگنڈہ نہ سمجھے گا۔ جواب آیا مجموعہ بھیج دیجئے ضرور اس پر لکھوں گا۔ مجموعہ بھیجدیا گیا جو چار پانچ مہینے ان کے پاس رہا۔ اس اثنا میں مقدمات کی رسم میری نظر میں بہت مبتذل معلوم ہونے لگی۔ میں نے طے کر لیا کہ میری غزل بغیر کسی تمہید کے شائع ہو گی۔ نیازؔ صاحب سے مجموعہ واپس منگا لیا۔ انہوں نے بھی یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ در حد درجہ نادم

ہوں کہ اب تک تعمیل ارشاد نہ کر سکا نہ جلد اس کی توقع ہے۔ کچھ دنوں
سے بعض ایسی اُلجھنوں میں مبتلا ہوں کہ دماغ ٹھکانے نہیں۔ میری خود
تمنا تھی کہ مقدمہ لکھتا لیکن وہ تمنا ہی کیا جو پوری ہو جائے"! بات ختم ہو
گئی۔ تقریباً تین سال ہوئے میں نے خواب دیکھا کوئی صاحب کہہ رہے
ہیں اپنے کلام پر خود تبصرہ لکھ دیجئے۔ میرے خواب محض خواب نہیں ہوتے
اور میرے سوانح زندگی کی پیشگوئیوں کے کئی ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہیں
جیسا "خواب پریشاں"[1] میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ میں ان کی اہمیت سے واقف
ہوں۔ مگر مجھے اس خواب نے بھی نہ چونکایا۔ میں نے قلم نہ اُٹھایا۔

میرے لڑکے لڑکیاں سب اردو پڑھے ہیں۔ تین لڑکے فارسی بھی پڑھے
ہیں۔ بڑی لڑکی نے عرصہ ہوا رسالہ "زمانہ" میں اکثر مضامین لکھے جن میں تنقیدی
بھی تھے۔ ایک بچہ سامی بی۔ اے میں اردو لئے ہوئے ہے اس کا بار بار
تقاضا ہوا کہ اپنی غزل سمجھا دیجئے کیا ہے۔ اکثر اشعار اثر کرتے ہیں۔ سمجھ میں
آتے ہیں مگر ان کی حقیقت روشن نہیں ہوتی۔ میں نے بھی سوچا کہ کم سے کم ان
بچوں کو میری شاعری خصوصاً غزل کی اصلیت سے بیخبر نہ رہنا چاہئے۔ لاؤ
چند سطریں لکھ دوں۔ چند ہی سطریں لکھ رہا ہوں مگر اشارۃً اس انداز سے
کہ ظاہر ہو جائے کہ غزل میری زندگی سے کیا ربط رکھتی ہے۔ میرے نفس و روح
کی ارتقائی منزلوں میں اس کا کونسا پہلو نمایاں ہے۔

"میری[2] زندگی کے چند رخ" کو ۱۹۴۳ء میں لکھ لیا تھا۔ بعد کو ترمیمات
برابر ہوتی رہیں۔ اب کہ جنوری ۱۹۵۲ء ہے۔ کم و بیش دو سال سے اعصابی

---

[1] میری مفصل سوانح عمری۔ [2] حدیث خودی کے حصہ اول کا پہلے یہی نام تھا۔

کمزوری بڑھ رہی ہے۔ دماغ بہت ضعیف ہو گیا ہے زیادہ غور و فکر نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا محض ایک خاکہ پیش کیئے دیتا ہوں۔ اتنی سکت نہیں کہ مجموعہ غزل کو شروع سے آخر تک ایک بار دیکھ جاؤں اور پھر تبصرہ کروں۔ اشعار بھی وہی پیش ہوں گے جو یاد آتے جائیں گے نہ کہ منتخب۔

کسی کے کلام میں دو باتیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ کیا کہا گیا ہے اور کس انداز سے کہا گیا ہے۔ دونوں نہایت وسیع بحث کی طالب ہیں۔ میں صرف پہلی بات کو لیتا ہوں یعنی میں نے کیا کہا ہے۔ دوسری بحث ایک جملے میں ختم ہے۔ اگر انداز میں اثر ہے تو سب کچھ ہے۔ اس اثر کا اندازہ دوسرے لوگ کر سکتے ہیں۔ شاعر کو تو اپنا کلام اچھا ہی لگتا ہے۔

شاعر کیا کہتا ہے :- شاعر وہی کہتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ دو چیزیں انسان میں ہیں ظاہر و باطن۔ ظاہر باطن کا مظہر ہے باطن ظاہر کا مرکز۔ ظاہر سے مراد کردار۔ یعنی اعمال و افعال جن میں بڑے بڑے واقعات و حالاتِ زندگی سے لیکر اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا، بولنا چپ رہنا، رہن سہن، عادات و خصائل، وضع قطع سب کچھ شامل ہے۔ انشاء ہو یا نظم یہ بھی اسی میں آجاتی ہے کہ وہ ایک فعل ہے۔ کردار سے کسی تصنیف کے محاسن و مصائب من و عن سمجھ میں آجاتے ہیں تصنیف سے کردار کے۔ کتنا ہی کوئی مصنف تصنیف میں اپنے کردار سے کچھ اور نمایاں ہونے کی کوشش کرے پردہ کھل جاتا ہے اور کردار کا جزو ثابت ہو جاتا ہے حقیقت مشکل سے پوشیدہ رہتی ہے۔

تصنیف کی دو صورتیں ہیں۔ نظم و نثر۔ نثر میں بہت سے اغراض و

مقاصد پیش نظر ہوتے ہیں۔ نظم میں بھی یہی بات ہے۔ لیکن غزل کی صنف اس سے مستثنےٰ ہے۔ غزل کی بنیاد سرتاسر طبیعت ہے۔ یہاں شعر طبیعت سے نکلتا ہے اسی کا رنگ ساتھ لاتا ہے۔ کوئی اور قسم کی تصنیف ہو مصنف پر پردہ ڈال سکتی ہے۔ غزل یہ پردہ اُٹھا دیتی ہے۔ شاعر کی جیتی جاگتی تصویر پیش کردیتی ہے۔ ضرور یہاں بھی تخیلی تصنع کو بہت دخل ہے۔ خصوصاً جہاں غزل گوئی قافیہ پیمائی ہو یا جہاں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہو مگر یہ تصنع بھی تو طبیعت ہی کا پہلو ہے۔ جہاں جذبات کی ترجمانی ہے وہاں خلوص ہے۔ صداقت ہے۔ ایک مشکل یہاں اور ہے تمام اشعار دل کے ہی ترجمان نہیں ہوتے۔ بہت سے عقل وشعور کے بھی منت گزار ہوتے ہیں۔ جو اخلاقی یا مذہبی یا دیگر معتقدات کی خبر دیتے ہیں۔ دل سے جو نکلتے ہیں اُن میں اور ان میں اکثر تبائن و تضاد نظر آتا ہے۔ ان میں سے کس کو شاعر کی روح کا مظہر سمجھا جائے۔ اسے سمجھنے کے لئے شاعر کے کردار پر گہری نظر ڈالنا پڑتی ہے۔ اشعار اور کردار دونوں سے اس کی شخصیت تک شخصیت سے باطن تک اور باطن سے نہاں خانہ روح تک بخوبی رسائی ہوجاتی ہے۔ معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا کہا گیا اور اس میں کتنا خلوص ہے۔ کتنی صداقت ہے یعنی شاعر کی ذات سے ہمرنگی ہے یا نہیں۔ اگرچہ وسیع معنی میں ہمرنگی ہو یا بے رنگی سب ذات ہی کے مظاہر ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس خلوص یا صداقت کی نوعیت کیا ہے اس کے سرچشمے کہاں سے نکلتے ہیں ظلمت سے یا نور سے۔ شعر ان باتوں کو کئی طرح نمایاں کردیتا ہے۔ تخیلات وجذبات سے، ترکیب و طرز ادا سے، مجموعی رنگ و اثر سے، ان سب میں طبیعت ہی کی جھلک

ہوتی ہے۔ جس کی طبیعت میں نرمی نہیں، لوچ نہیں، گداز نہیں اس کے اشعار بھی اس سے خالی ہوں گے۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ روح اور اس کے مظاہر میں یکرنگی تلاش کر کے صحیح صحیح اور پورے پورے خط و خال اس تصویر کے نمایاں کر دے جس کا نام شاعر ہے۔ اشعار و کردار سے اس مقصد کو پہنچنا نقاد کے لئے بڑا نازک، بڑے صبر و سکون اور بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ یہاں بڑے دماغی توازن سے کام لینا ہوتا ہے یہ صراط مستقیم ہے۔ اس پر چلنا ہر ایک کا کام نہیں تنقید کا فرض اہل فرنگ نے خوب انجام دیا ہے۔ ان کے یہاں سوانح نگاری میں اسلاف پرستی کا شائبہ نہیں۔ پوست کندہ حالات لکھتے ہیں۔ فن کو فن کی کسوٹی پر کستے ہیں۔ بے لاگ رائے زنی کرتے ہیں کمال کی کسوٹی میں ذاتی جذبات کا دخل نہیں۔ اہل کمال کو مافوق الفطرت ہستیوں میں جگہ دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہمارے یہاں اس کے خلاف اسلاف پرستی ایک فرض ہو گیا ہے۔ ہم کمال کی رفعتوں پر قانع نہیں رہتے۔ اہل کمال کو ہادیان دین و ایمان کی مجلس میں جلوہ افروز دیکھنا چاہتے ہیں۔ کتنا غلط اور صداقت سے بعید شیوہ ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری نظر نظر نہیں رہتی۔ محض ثنا و ستائش کی زبان بن جاتی ہے۔ حقیقت چھپ جاتی ہے۔ شاعر کی ذات پر مصنوعی پردے پڑ جاتے ہیں۔ کمال غائب ہو جاتا ہے۔ ایک عجیب قسم کا پیکر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جس کے داغ اس مصنوعی رنگ کے سامنے اور بھی ابھر آتے ہیں جو اس پر چڑھا دیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا کمال بجائے خود قدر و منزلت کے لئے کافی نہیں۔ بقائے حیات کے لئے کافی نہیں۔ اس پر فقر و

ولایت کی چھاپ لگا دینا کیا ضرور۔ کالیداس شیکسپیر اور فردوسی ولی یا پیمبر نہیں تھے۔ اگر اخلاق و ایمان کی ہی بلندیوں کی تلاش ہے تو شعرو ادب کی محفل میں نہ آئیے۔ خانقاہوں اور حجروں کا طواف کیجئے۔

غور کرو اس افراط و تفریط نے غالب کے ساتھ کیا کیا۔ محمد حسین آزاد ذوق کے شاگرد تھے۔ ان دونوں پر محاکمہ کرتے ہوئے آزاد نے غالب کو گرایا۔ غالب کے شاگرد رشید حالی نے "یادگار غالب" عقیدتمندی کے ایسے جوش میں لکھی کہ غالب پرستی ایک طرہ امتیاز ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالب کو الہامی کتاب کہدیا۔ جواب میں تنقیل اور غالب اور "غالب شکن" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اب غالب کی حقیقت سمجھنے کے لئے ادب کے طالب علم کو ان سب تصانیف کا مطالعہ لازمی ہے اور مطالعہ صاف ذہن سے ہو، نہ دل میں عقیدت کا شائبہ ہو نہ مخالفت کا۔

جس طرح ایک ننھے سے دانے کے جسے تخم کہتے ہیں، بطن میں تناور درخت موجود ہوتا ہے اسی طرح بچے میں انسان۔ جوں جوں بچہ نشوونما پاتا ہے اس کے دل و دماغ کی تہیں کھلتی جاتی ہیں۔ زندگی ایک خاص روش پہ آجاتی ہے۔ ماحول، تواتر، بود و ماند، حرکات و سکنات، خیالات و تصورات، واقعات و حالات، ذات کے خاکے میں خاص رنگ بھر کر اس انسان کی ارتقائی صورت مکمل کر دیتے ہیں جو بچے کے اندر مقید ہوتا ہے۔ شاعر بھی اسی آئین ارتقاء کا پابند ہے۔ اس کے مکمل پیکر کا اندازہ لگانے کے لئے بڑی وسیع، عمیق اور صحیح نظر کی ضرورت ہے۔ اس کی طبیعت کی چگونگی، کیفیتوں کی نزاکت، تصورات و تاثرات کی گوناگونی تک پہنچنے کے لئے جتنا وسیع اس کی ذات کا علم

ہوگا اتنا ہی اس کے شعر کا مفہوم حقیقی ہوگا، پُرخلوص ہوگا اور اس سے خود شاعر کا پیکر قائم ہونے میں انصاف کا حق ادا ہوگا۔ جتنی اس کی تفصیلات و جزئیات حیات سے واقفیت مکمل ہوگی اتنی ہی اس کی شاعری کی تصویر صحیح اور بے لاگ نظر آئے گی۔ یہ بھی یاد رہے کہ شاعر عام فطرت لیکر نہیں آتا۔ اس لئے اس کی زندگی بھی عام رنگ کی نہیں ہوتی جو لوگ شاعر کی زندگی پر نظر ڈالے بغیر یا اسے محض رسمی و سواجی واقعات و کیفیات کا مجموعہ سمجھ کر اس کے شعر کا جائزہ لیتے ہیں وہ یک طرفہ نظر سے کام لیتے ہیں۔ وہ جو نقشہ پیش کرتے ہیں ناقص ہوتا ہے۔ اس سے ایک مکمل وجود کا ایک ہی رُخ سامنے آتا ہے۔ حیات کو سمجھے بغیر غلط فہمیاں ہونا لازمی ہے۔ یہ غلط فہمیاں شاعر کو مجروح کر دیتی ہیں۔ ناقدوں پر خنجر زنی کا الزام عائد کرتی ہیں۔ اس جرم میں وہ بھی گرفتار ہیں جو بیجا ستایش کرتے ہیں اور وہ بھی جو حرف گیری پر اُتر آتے ہیں

مَیں نے کیا کہا:۔ ہر شخص کو اپنی ذات کا جتنا علم ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ شاعر ہی اپنے کلام کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے اگر دیانتداری سے کام لے۔ مَیں نے اپنی سوانحمری "خوابِ پریشاں" خود مرتب کی ہے جو طولانی ہے۔ اپنی نہایت پُر اسرار زندگی کے متعلق ایک دوسری کتاب "مسٹریز آف مائی مائنڈ" لکھی ہے۔ بس ہی اپنی شاعری پر صحیح روشنی ڈال سکتا ہوں دوسرے یہ کہ جہاں اپنے متعلق مَیں نے صدہا صفحے لکھے ہیں۔ شاعری پر خصوصاً غزل پر کہ وہ میری رُوح سے تعلق رکھتی ہے روشنی ڈالنا میرے مدارج ارتقائی کا ایک اہم جزو بن جاتا ہے۔ مَیں اس جزو کی وہ صورت پیش کئے دیتا ہوں جو ایک سلسلہ وار

نشو و نما کی اہمیت رکھتی ہے۔ اب اسے کوئی کچھ سمجھے کچھ کہے۔

اب اشارہ حسن کا ہے میرا چرچا کیجئے
خود بھی رسوا ہوجئے مجھ کو بھی رسوا کیجئے

میری غزل

غزل سے اے جگر اندازہ کر میری حقیقت کا
غزل میں کیفیت کچھ رُوح کی محسوس ہوتی ہے

اپنے حالات میں لکھ آیا ہوں کہ میں ارادتاً شاعر نہیں ہُوا۔ قدرت نے مجھے جبراً شاعر بنا دیا۔ خدا گواہ ہے میں نے شعر نہیں کہا کسی نے بے اختیار کہلایا ہے۔

تھی کرامت ہوائے صحرا کی ورنہ ہوتا جگر نہ سودائی

رُوح میں ایک جوش تھا جو اُبل نکلا۔ خم میں ایک شراب تھی جو خود بخود چھلک پڑی اسی جوش میں غزل کا نہال اُگا بڑھا اور پھولا پھلا۔ اسی شراب سے اس کی آبیاری ہوئی۔ شروع ہی سے 'قافیہ پیمائی' سے مجھے پرہیز رہا۔ بے بنیاد خیالات سے پرہیز رہا۔ غور و فکر کو بہت زحمت دینا پڑتی تھی اس لئے کہ جو معنی اور جو پیرایہ بیان متصور و مقصود ہوتے تھے ان کی تشکیل ہو سکے، کسی صورت سے کم پر قناعت نہیں کی۔ اُپج کے مطابق مشق تھی نہیں، غور و فکر غوطے پر غوطہ لگاتا تھا کہ طبیعت کی پسند کا موتی نکالے۔ موضوعات میں عقاید و خیالات ہیں اور کیفیات قلب تخیل سے صرف سانچے کا کام لیا گیا ہے۔ کمہار کا کام لیا گیا ہے مٹی کا نہیں کیفیات قلب ایک رَو میں ادا ہوئی ہیں جس کے سرچشمے کا خود مجھے پتہ نہیں۔

تھا حجاب حُسن کا یہ اثر کسی خود پرست کو کیا خبر
جو ازل سے سینے میں جوش تھا وہی بن کے شورِ فغاں اُٹھا
کسی میکدے میں رہا مگر کہ تھا محو خواب میں رات بھر
ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اُٹھا تو زمزمہ خواں اُٹھا

یہ جوش کیا تھا۔ شراب کیا تھی۔ کچھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تو یہاں سب سے پہلی چیز جس کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے حسن ہے۔ میرے حالات بتاتے ہیں کہ کس طرح بچپنے سے حسین مناظر، دلکش تصاویر، نغمہ و سرود میری رُوح میں نشاط سے ایک ہیجان پیدا کر دیتے تھے لیکن دل میں ہوک اُٹھتی تھی وہی ہوک جو دل کے کشتہ و برشتہ ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے جس کو میر دردِ بجلی کہتے ہیں۔

آتش عشق قہر آفت ہے ایک بجلی سی آن پڑتی ہے

بالکل یہی کیفیت میری تھی بلکہ کچھ اس سے بھی سوا۔ حُسن شعلہ بنکر جان میں اُترتا تھا۔ برسات کے موسم میں حُسن کی جلوہ سامانیاں بے پناہ ہوتی تھیں معلوم ہوتا تھا کوئی دل کو بالکل مسوس ڈالیگا یا وہ جھلس کر رہ جائیگا۔ یہ جذبات مختلف نظموں کی صورتیں اختیار کرتے رہے مثلاً "پپیہا اور پی کہاں"، "برسات" وغیرہ مختصر سی نظم "ننھا جنگلی پھول" سے اس بے پناہ درد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شاعری کے ابتدائی دور کی نظم ہے۔

ننھا جنگلی پھول

اُف یہ رنگینی و دلآویزی اُف یہ رعنائی و جنوں خیزی
اُف یہ نقش و نگار زیبائی اُف یہ جوش بہار زیبائی

شوق نے حشر کر دیا دل میں — سوز ہی سوز بھر دیا دل میں

اُف یہ اضطراب کا عالم — دل ہے اور ایک لرزشِ پیہم

چاہتا ہوں کہ رازِ حسن کہوں — ہائے میں اپنے آپ میں کب ہوں؟

کیا کہوں تو جہاں میں کیا شے ہے — عقل جاتی رہی میری ہے ہے

ہلکا پھلکا ہے دھان پان ہے تو — خوبی و نازکی کی جان ہے تو!

ایک تصویر تیرا چہرا ہے — دفترِ حسن کا خلاصہ ہے

اور بھی پھول ہیں جہاں میں بہت — قدر ہے جنکی گلستاں میں بہت

ان میں یہ خوبیِ جمال کہاں؟ — ان میں یہ شانِ ذوالجلال کہاں؟

مُہرِ مکتوبِ حسن یار ہے تو! — مردمِ دیدۂ نگار ہے تو! !

ماند ہے تجھ سے رونقِ گلزار — گرد ہے تیرے آگے رنگِ بہار

یُوں تو کہنے کو نیلگوں ہے تو — گرمیٔ حسن کا فسوں ہے تو

پھونک ڈالے دل و جگر تو نے — بھر دیئے سینے میں شرر تُو نے

آہ صبر و قرار کھو بیٹھا — راحتِ زندگی کو رو بیٹھا

ہے عجب کیف لیکن اس غم میں — اڑ رہا ہوں میں اور عالم میں

اب یہی جان کی تمنا ہے — اب یہی رُوح کا تقاضا ہے

تیرے سایہ میں خاک پر بیٹھوں — دین و دُنیا سے بے خبر بیٹھوں

اور سجدے میں ہو جبیں میری — تر ہو اشکوں سے آستیں میری

ان چند اشعار سے صاف نمایاں ہے حُسن کی جلوہ سامانیوں کا وہ اثر جس نے میری روح میں ہلچل مچائے رکھی۔ غزل حُسن کی صورت گری اور منظر نگاری کا مستقل میدان نہیں۔ یہ رُخ نظم نے پیش کیا۔ کیفیات قلب یا جذبات و تاثرات غزل میں آ گئے۔ ان کا ماخذ میری فطرت ہے۔ قبل اس کے کہ اپنی

فطرت کا تار و پود بکھیروں، اپنے عقائد کا تجزیہ کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ میری غزل بقید زمانہ ترتیب دی گئی ہے۔ عقاید بھی رفتہ رفتہ پختہ ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہیں کہیں ان میں تضاد نظر آئے اس کا ذمہ دار عمر و تجربات کے ساتھ کا شعور ہے

بچے میں انسان کا ہونا سب سے پہلے عقل و شعور سے تسلیم ہوتا ہے اور عقل و شعور کیا ہیں۔

عقل و شعور:۔ ہوش و خرد و شعور و ادراک۔ ڈالے ہیں حقیقتوں پہ جلباب

عقل و شعور بھی ہیں کیا عقدۂ راز دہر ہیں
رہ گئے اور الجھ کے ہم سعیٔ کشود راز میں

یا ہم تھے یا خدا تھا کوئی دوسرا نہ تھا
ہوش و خرد نے ڈال دیا اشتباہ میں

یقین:۔ دل ہے بر نشاط یقیں منزل نشاط
دوزخ کی آگ ہے تو جگر اشتباہ میں

خودی و بیخودی:۔ بیخودی راز ہے تجدید خودی کا یعنی
بہر جمعیت خاطر ہے پریشاں ہونا

خودی میں دلیں ہو تو بیخودی ہیں دل تجھ میں
جو یہ نہیں تو جہنم ہے زندگی مجھ کو

تصور:۔ لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

بت پرستی کسی عالم میں نہ چھوٹی ہم سے
ہر تصور میرا تصویر بداماں نکلا

بُت پرستی

صنمخانوں میں سجدوں کی کرامت ہم نے دیکھی ہے
ہجومِ شوق کا وہ مشعلِ تنویر ہو جانا

شوق نے کر دیا ہے دیوانہ
ذرّے ذرّے کو سجدہ کرتا ہوں

کعبہ و کلیسا

دل کیجیے وسیع نظر کیجیے بلند
کعبہ بنائیے نہ کلیسا بنائیے

ابھی باقی ہیں کعبے اور بتخانے کی تعمیریں
ابھی دُنیا میں کوئی تیرا دیوانہ نہیں آیا

دین و ایمان

خود شناس ہوا اگے دل پیروئ ملت کیا
دین جس کو کہتے ہیں شخصیت پرستی ہے

حوصلے مٹ کر رسوم دین و ملت بن گئے
پست ہو کر ہمتیں طوق و سلاسل ہو گئیں

طاعت و عبادت

اصل حق پرستی کی کیا ہے خود پرستی ہے
خاک راہ دل ہونا مدعائے ہستی ہے

محویت غم نماز دل ہے
دیوانہ ہوں اپنی بندگی کا

دوزخ و جنّت

اب یاد رہ گئے ہیں فقط دوزخ و بہشت
گزرے بہت نشیب و فراز اس کی راہ میں

دیکھا کئے نگاہ تیری ہم تمام عمر
دوزخ میں جا پڑے کبھی جنت میں آ گئے

جزا و سزا ایک وقت تھا جب میں عمل و مکافات عمل کا قایل تھا۔ زمانے کے مشاہدات اور اپنی زندگی کے تجربات نے اس اعتقاد کو پاش پاش کر دیا۔ اب میرا ایمان ہے

مزاجِ حسن کا اک عالم تلون ہے — کچھ اور اسکے سوا رمز کائنات نہیں
آغاز کی خبر ہے نہ انجام کی خبر — تفصیر کیا بتائے گرفتار زندگی
زندگی اپنی نہ موت اپنی دل اپنا نہ دماغ — کون کہتا ہے کہ مختار ہوں مجبور نہیں
وہ جبر ہے جسے سب اختیار کہتے ہیں .. گناہگار نہ ہوں ہم گر اختیار نہ ہو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو عقل دی گئی ہے کس لئے ہے۔ عقل و شعور کے ساتھ گناہ کی ذمہ داری سے سبکدوشی کیسی۔ ایسے خیالات گمراہ کن ہیں محض بہانہ ہیں مکافات عمل سے بچنے کا۔ اب عقل کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو۔

عقل کل آدمی کی ذات نہیں — عقل کی بات کوئی بات نہیں
عقل کی ہیں جدا جدا راہیں — اور جنوں میں کچھ ایسی بات نہیں

یہ جنوں بہت وسیع ہے

عقل سے حاصل ہوا گر کچھ تو یہ حاصل ہوا۔ اک اذیت تنگیٔ زنداں ہیں آزادی مجھے

مجھے گناہ میں یقین ہے نہ مغفرت میں اعتقاد۔ اُس معصیت کا قایل ہوں جو بنی نوع انسان کے باہمی رشتے پر حرف لائے۔ انسانیت کے دامن پر داغ ہو۔ ہر انسان کو اپنے ماں باپ اپنی سماج اور قوم کا کچھ فرض ادا کرنا ہے۔ سنسار ایک بہت بڑا کنبہ ہے جس میں ہر مرد عورت کے کچھ فرائض ہیں کچھ حقوق ہیں انہیں ادا نہ کرنا اور ان سے غافل رہنا معصیت ہے

تدبیر و عمل: میرا یقین ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے مقدرات سے ہی۔ ایک اعتراض یہاں وارد ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو

سعی و تدبیر بے معنی ہیں۔ آدمی کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا چاہیئے۔ نہیں ایسا نہیں۔ یہ آئین فطرت اور قوانین حیات کے خلاف ہوگا۔ ہاتھ پاؤں کام کرنے کے لیئے ہیں۔ دل احساس کے لیئے، دماغ سوچنے، ارادہ کرنے اور اس پر عمل کرانے کے لیئے۔ اگر یہ سب معطل کر دیئے جائیں تو آثار زندگی ہی مٹ جائیں۔ مقتضیات فطرت کیونکر پورے ہوں۔ زندگی اپنی ارتقائی منازل کس طرح طے کرے۔ تدبیر و عمل ناگزیر ہیں۔ انسانی قویٰ اپنے فعل و عمل سے باز رہ ہی نہیں سکتے۔ ہر وقت آدمی کچھ سوچتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ وہ فعل و عمل سے دستبردار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیئے ان کو سعی و تدبیر کی صورت دینا عین حکمت ہے اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے۔

رفتار فرض ہے تو قدم کیوں غلط پڑیں
ہر چند ہم اسیر زماں و مکاں سہی

ذیل کے شعر سے میرا عقیدہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔

جس سے کھل جائے فریب حسن تدبیر و عمل
ایسی بھی اک کوشش ناکام ہونا چاہیئے

انسان کو تدبیر و عمل میں حد بھر قوت صرف کرنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ انسان کی تمام قوتیں محدود ہیں۔ ہزار ہا کامیابیوں کے بعد بھی آخری نتیجہ ناکامی ہے۔ اس آخری ناکامی میں جو فضیلت ہے اسے حاصل کرنا بشر کا فرض ہے ورنہ اس پر یہ راز آشکارا نہیں ہو سکتا کہ تمام قوتوں اور قدرتوں سے بالاتر بھی ایک قدرت ہے جسے قادر مطلق کہتے ہیں۔ فریب حسن تدبیر و عمل کھل جانے کے یہی معنی ہیں کہ اپنی ناکامیوں سے متاثر

ہو کر قادرِ مطلق کی لا محدود قوت و اختیار کے آگے بشر سر جھکا دے۔
اصل میں سائنس کا یہی مقصد ہے اور سچے سائنسدانوں کا یہی عقیدہ۔
اب ان اشعار پر بھی غور کیجئے :-

ہے ایمنِ وقار عجز و نیاز　　وہ تمنا جو بر نہیں آتی
شادابیٔ چمن کی بھی تدبیر فرض ہے　　دو چار روز ہی کو کوئی مہماں سہی
مقصود ایک لذت تدبیر تھی سو ہے۔ تدبیر ناتمام سہی رائگاں سہی
اس ضمن میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

یہ کہے زمانہ جواں ہے تو قدم ایسا مردِ جواں اُٹھا
جو نہ بارِ عشق اُٹھا سکے تو بلا سے تیغ و سناں اُٹھا

ترک تدبیر ہو یا ترک دُنیا مَیں دونوں کو مقتضیات فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں بلکہ ایک کو کاہلی اور دُوسری کو بُز دلی۔

جو تاب آزمائشِ ہستی نہ لا سکا۔ تسبیح لیکے بیٹھ رہا خانقاہ میں

مَیں ہستی کا قائل ہوں عدم کا نہیں۔ انسانی زندگی ہستی مطلق کی ایک ادا ہے اور موت ایک تبدیلی کی صورت۔

زندگی اک ادائے ہستی ہے　　میرا ہونا ہی خود پرستی ہے
مَیں حباب ہُوں تو کیا بے ثبات ہُوں تو کیا
میری خود نمائی سے جوشش بحرِ ہستی ہے
جانِ دریا ہے کیا روانی ہے　　موج در موج زندگانی ہے

وحدت و کثرت
شمع کو نور شمع گھیرے ہے۔ ایک تو ہی ہجوم کثرت میں
تجھی سے ہے تیرے جلوؤں کو بھی نمود و فروغ
سوائے پرتو ذات اور کچھ صفات نہیں

حقیقتِ عالم:- تھا ازل میں جو میری حسن تصور کا فروغ
آنکھ کھولی تو وہی عالم امکاں نکلا

حسن نے روز ازل جب رخ سے سرکائی نقاب
چند جلوے رنگ بنکر بزم امکاں ہو گئے

حسن و عشق:- عشق اک شعلہ لرزہ بر اندام - حسن اک برق مضطرب مستور
عشق و حسن ایک تجلی کے ہیں پرتو لیکن
بزم عالم میں وہ پنہاں یہ نمایاں نکلا!

محبت:- کیا اسی کا نام ہے سوز محبت ہمنشیں!
ایک بجلی سی میری رگ رگ میں لہراتی تو ہے

کہئے اسے محبت جب زہر غم اتر جائے
شربت کا گھونٹ جیسے شدت کی تشنگی میں

ہجر و وصل:- قصۂ ہجر و وصل کیا جانیں
سرحد آرزو سے ہم ہیں دور

حقیقتِ دل:- دل ہے وہ بارگاہِ جلوۂ عشق
جس میں دنیائے حسن بستی ہے

نصیب سے میرے پہلو میں دل نکل آیا
وگرنہ دور بہت بارگاہ ہے تیری

صبح ازل ہے صبح حسن شام ابد ہے داغ عشق
دل ہے مقام ارتباط سلسلۂ دراز ہیں!

حقیقتِ بشر ظاہری و باطنی کچھ ہوا بھر دی گئی ہے خاک کی تعمیر میں
موت ہنستی ہے میری ہستی کا ساماں دیکھ کر

کچھ جلوۂ خیال ہے کچھ گرمیٔ عمل
اتنی ہی کائنات جہانِ بشر کی ہے

پرتوِ حسن دوست ہیں ہم بھی
اپنی ہستی بھی جاودانی ہے

کچھ جلوہ ہائے رُوح بھی ہیں دل میں صرف کار
صرف ایک اجتماع عناصر نہیں ہوں میں

مآلِ زیست:-
مآلِ زندگی ہے عشق کی تعبیر ہو جانا
فدائے حسن یوں ہونا کہ خود تصویر ہو جانا

کوئی جینے کو سمجھے مایۂ عشرت بُرا کیا ہے
مجھے تو اک عبادت زندگی محسوس ہوتی ہے

مُرشدِ کامل:-
چلے چلو دل بے مدعا جہاں لے جائے
پڑو نہ پھیر میں تدبیر کیا ہے کیا تقدیر!

اضطرابِ روح ہے رمز آشنائے جذبِ حسن
ہو رہی ہے کی خود بخود حاصل اب آزادی مجھے

یہ رہے میرے اجزائے عقائد اب اپنی فطرت کے بخیے بھی ادھیڑتا ہوں۔ یہاں پہلی چیز **غیرت** نظر آتی ہے۔ وہی غیرت جس کے متعلق میر[1] کہتا ہے۔

ہائے غیوری جس کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا!
دیکھتے اس کی اور نہیں پھر یہ بھی ہماری غیرت ہے

محرومِ سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے
جوشِ حیا سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا

(۱ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۵ پر دیکھئے۔)

محو دُعا تھے اکثر غیرت سے لیک گیا ہے

آیا نہ نام اس کا میری زباں کے اُوپر

مَیں اپنی غیرت کے متعلق کیا لکھوں بوڑھا ہُوا۔ لڑکے ہنسیں گے۔ پردہ داری ہی اچھی ہے۔ میرے اشعار سُنئیے اور ان پر غور کیجئے:۔

دوست پر بھی گمان غیر ہُوا | اک قیامت ہے عشق دلِ طبعِ غیور

دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے | ہائے کیا راز ہے محبّت کا!

آزاد مزاج لوگ کہیں گے کہ غیرت و عشق میں کیا ربط ہے۔ ربط ہے اور بہت گہرا، بہت لطیف و نازک، وہی جو حسن و حجاب میں ہے۔

حجاب اک رمزِ محجوبی ہے حسنِ جلوہ ساماں میں

جھلک کر رہ گئیں رنگینیاں گلہائے خنداں میں

حجاب و حسن کا تعلق اس شعر سے اور واضح و استوار ہو جاتا ہے:۔

تیر بن کر بیٹھتا ہے اُف یہ اندازِ حجاب!

توڑے دیتا ہے رگِ دل ان کا پردہ اور بھی

پردہ، حجاب، حسن کی کرشمہ سازیوں کو بجلیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی اعجاز عشق کے ساتھ غیرت کرتی ہے۔ وہ تڑپ پیدا کرتی ہے جیسے آگ لگ جائے۔ حسن و عشق کے معاملات پردہ داری و غیرت مندی میں جو مزا دیتے ہیں۔

لہ ایک زمانے میں رسالہ "نیرنگ"، دہلی میں اس شعر پر بحث چھڑی تھی۔ بڑے بڑے ادیب اس میں شامل تھے حیا کے معنی ہی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ عجیب عجیب الفاظ اس کی جگہ تجویز کئے گئے جیسے جبہہ، سبھ، وغیرہ۔ جب میرا مضمون حیا کے معنی بیان کرتے ہوئے اس شعر کے متعلق شائع ہوا تو بحث ختم ہوگئی۔ — جگر بریلوی

بے تکلفی و بیباکی میں نہیں۔ ایک طرف حجاب کرشمہ و ناز میں چار چاند لگا دیتا ہے دوسری طرف غیرت محبت کو ایک لطیف بجلی بنا دیتی ہے۔ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ اشتیاق میں وہ نفاست و شدت آ جاتی ہے جو احساس ہی سے تعلق رکھتی ہے، بیان سے باہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرف آرزو زبان پر نہیں آتا۔ محبوب پر آنکھ نہیں اٹھتی۔ جوش شوق غیرت میں گھل مل جاتا ہے۔ مآل محرومی ہوتا ہے۔ اب میر کے اس شعر پر غور کیجیے۔

محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے
جوش حیا سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا

میرے اشعار پر پھر نظر ڈال لیے۔

دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے
ہائے کیا راز ہے محبت کا!

دوست پر بھی گمان غیر ہوا
اک قیامت ہے عشق و طبع غیور!

یہی غیرت میری زبان پر ان جذبات و تاثرات کے اظہار کے لیے مہر بنی رہی ہے جو گوشت و پوست کے محب و محبوب کے باہمی راز و نیاز ہجر و وصال وغیرہ و غیرہ کی کیفیتوں سے متعلق ہیں اور جن سے میں ناآشنا نہیں۔

غیرت کے بعد **خلوت پسندی** ہے۔ بچپن میں بھی جس کی طبیعت لہو و لعب سے بھاگے اسے جوانی میں ہو حق کی صحبتیں کیا پسند آئیں گی۔ یار باشی، یاروں کی ہنگامہ آرائی سے ہمیشہ میں دور رہا۔ بستی سے باہر پھرنے یا تنہا نشیں رہ کر دل کی طرف محو ہونے میں عجب لطف آتا تھا۔

کھل گئی دل سے راہ و رسم کلام
ہم کو جنت ہے کنج تنہائی

اسی سے رہتے ہیں راز و نیاز آٹھ پہر
چھپی ہوئی ہے جو دل کی تہوں میں اک تصویر

یہ نہیں کہ دوستوں کی مجھے تمنا نہ رہی ہو۔ یہ نہیں کہ باوجود غم پسندی و

سنجیدہ مزاجی کبھی ہنستا ہی نہ ہوں ہمیشہ روتا بسورتا رہتا ہوں یا زاہد خشک ہوں۔ دوستوں کے لئے روح میں پیاس تھی۔ ان کی صحبت میں خوب ہنستا تھا۔ دل کھول کے۔ ہاں دوست ایسے مطلوب تھے جن میں ظاہری طمطراق کے بجائے خلوص ہو، پاکیزہ خلقی ہو۔ جن کی صحبت میں کوئی پردہ کوئی تکلف محسوس نہ ہو۔ ملازمت کے زمانے میں کبھی اپنے چاروں طرف کسی قسم کا حلقہ نہ بننے دیا۔ کارِ سرکاری کی مصروفیتوں کے علاوہ جو وقت بھی گزرتا تھا مطالعہ کتب میں یا تصنیف و تالیف میں۔ شام کا وقت، اگر کہیں اس کا انتظام ہوا تو ٹینس کھیلنے میں گزرتا تھا۔ غرض گھر پر رہا یا باہر فضول ملنے جلنے اور خواہ مخواہ کی صحبت آرائیوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خلوت کی کیفیت کو آلودہ کر رہا ہوں۔ نہاں خانہ دل میں جو کسی کی بے حجابی کا کیف ہے اسے مکدر کر رہا ہوں سب نامحرم سے معلوم ہوتے تھے۔

مجھے خلوتوں سے ہے کیوں لگن مجھے جلوتوں سے ہے کیوں جلن
مجھے زینتیں ہیں عزیز کیوں جو وہ دل میں پردہ نشیں نہیں

سکوت خلوت پسندی کا ایک فیض سکوت سمجھئے۔ گفتگو خوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔ نہایت ضرورت کے وقت بولنا فرض ہے ورنہ نہیں۔ جو بات منہ سے نکلتی ہے بعض وقت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کوئی پیمان کر رہا ہوں یا اپنے متعلق پیشینگوئی کر رہا ہوں۔ کوئی بری بات منہ سے نہ نکل جائے کہ اُلٹی پڑے۔ ہنسنے نہ پاؤں کہ غم اٹھانا پڑے۔ لفظ لفظ تول کر ادا کرنا پڑتا ہے ذرا زبان کو لغزش ہوئی اور افسوس کا سامنا ہوا۔ کوئی اُلٹی سیدھی بات منہ سے نکلی اور پچھتانا پڑا۔ ضرورت سے زیادہ گفتگو میں غم نہانی کی سبکی توقیری محسوس ہوتی ہے۔ محویت دل کی سبکی

اور قوت جاں میں زوال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کھوئے دے رہا ہوں۔ مہرِ خموشی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ملنے آتا ہے تو رسمی دعا سلام کے بعد سمجھ ہی میں نہیں آتا کیا بات چیت چھیڑوں۔ اکثر لوگ متکبر سمجھ لیتے ہیں۔ آخر لکھنا پڑا۔

ظلم ہے میری خموشی پہ گمانِ نخوت ہمنشیں محو دلِ زار ہوں مغرور نہیں

وقارِ نفس بچپن میں بھی مجھے والد آنجہانی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلاتے ہوئے ناگوار ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کو خفیف کر رہا ہوں۔ حتے الامکان اس سے بچتا تھا۔ کھانے پر بیٹھتا ہوں کوئی چیز نہ رہے تو مانگتے ہوئے اب تک کہ بوڑھا ہوا ہوں سبکی محسوس ہوتی ہے۔ اہل جاہ و ثروت جنہیں بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔ ان سے ملنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ ملازمت کے زمانے میں حکام سے ملنے سے اجتناب اسی لئے رہا کہ حکومت و نخوت کا لب و لہجہ برداشت نہ ہوتا تھا۔ ذرا کسی کے تیور بدلے دیکھے، میں حاضری سے باز رہا۔ آٹھ آٹھ مہینے گزر گئے شہر میں ہوں کلکٹر کے سلام کو حاضر نہ ہو سکا۔ جب مجبوراً سامنے آنا پڑا تو اپنی کوتاہی آداب کا جواب دینا پڑا۔ انہیں باتوں نے، حکام کی ناز برداریاں، خوشامد اور تملق تو دور ترقی کی جائز درخواست کو بھی مشکل سے لب پر آنے دیا۔ جانتا اور مانتا تھا کہ کہاں بندگی بیچارگی کہاں یہ خود پسندی۔ اس سے اور سود و بہبود سے کیا واسطہ مگر اس روش میں تبدیلی نہ ہو سکی۔ یہ روش کیوں تھی شاید اس شعر سے سمجھ میں آجائے۔

اپنی خودداریوں پہ مرتے ہیں جو تیرے تیوروں کے محرم ہیں

خودداری کے آگے بھی ایک چیز ہے :۔

زمیں پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبینِ نیاز — نشانِ سجدہ غمِ دل کو ناگوارا نہ ہو

پاسِ وفا

میں محبت اور وفا میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ جس محبت میں وفا نہیں ہوس کاری ہے، نفس پرستی ہے۔ میرا ایمان ہے

ایک ہی بار عشق ممکن ہے — کہ جگر ایک زندگانی ہے

دردِ دل

کسی کی تکلیف مجھ سے نہیں دیکھی گئی۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بعض اوقات بے اختیار آنسو نکل آئے ہیں۔

کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے — یہی دل چاہتا ہے ہم بھی رو لیں

اُف کسی دردمند کی آواز — تیر سا دل کے پار ہوتا ہے

کسی کو دیکھتے کیوں آہ روتے — جو بس چلتا تو ہم پیدا نہ ہوتے

پرسشِ آزردگانِ غم کی قدرت بھی نہیں

کچھ تو دل کے ساتھ مل جاتا خدایا اور بھی

والد آنجہانی عجب دردمند دل رکھتے تھے ہم لوگوں کو بچپن سے ان کی تعلیم تھی۔

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کن

کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

کچھ ان کا فیضانِ تربیت کچھ اپنی فطرت، دشمن کی آزار رسانی کی تدبیر بھی کبھی نہ سوجھی۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ جس نے دشمنی برتی اس کے انتقام کا خیال بھی دل میں نہ آیا ہو۔ آیا لیکن سخت اذیت پہنچنے پر اور کبھی اس خیال نے قابو ہوتے ہوئے بھی عملی صورت اختیار نہ کی۔ ایک مرتبہ ایک ایسے کایستھ تحصیلدار سے سابقہ پڑ گیا جو خود کہتا تھا اور فخر کے ساتھ کہ میں شیطانِ مجسم ہوں۔ اس کے برتاؤ سے مجھے روحانی ایذا پہنچی۔ انتقام کی آگ میرے دل میں بھڑکی۔ مسالہ بھی ہاتھ لگ گیا جو ایک کاری آلہ ضرب تھا۔

جب عمل کا وقت آیا دل لرز گیا ارادہ کام آیا نہ آلۂ ضرب۔

میں اپنے ملازموں سے کام لیتا تھا مگر ہمیشہ یہ خیال دامنگیر رہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ان کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ ہم ہیچ سمجھے جاتے ہیں میں نے ایک کام اپنے ملازموں سے کبھی نہیں لیا یعنی ہاتھ پاؤں دبوانا۔ میں کسی شخص کو ملازم سے ہاتھ پاؤں دبواتے دیکھتا تو دل میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ یہ تماشا نہایت انوکھا اور غیر فطری معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدمی پاؤں پھیلائے آرام سے پلنگ پہ پڑا ہے اور ایک آدمی ہاتھ پاؤں داب رہا ہے۔ میں نے اپنے ملازموں کے آرام کا بھی بہت خیال رکھا ہے۔ اگر کہیں باہر سے شب کو نا وقت واپس ہوا ہوں ضرورت ہونے پر بھی انہیں نہ جگایا۔ چپ چاپ مکان کے اندر یوں چلا آیا جیسے کوئی آیا ہی نہیں۔ انھی جذبات کو ذرا وسعت دیدیجئے:۔

گزر رہا ہوں دبے پاؤں میں زمانے سے

کسی کی نیند اچٹ جائے یہ نہیں منظور

عزیزوں کا تو مرتبہ ہی اور ہے ماتحتوں کے ساتھ بھی ہمیشہ یہ روش رہی کہ مجھ سے نفع ہی پہنچے جہاں یہ نہ ہو سکا، اور وہ پچیس سال کی ملازمت میں ایک مثال ہے کہ ایک محرّر مویشی خانہ میری ابتدائے ملازمت اپنی اشتعال انگیزی اور میری نا تجربہ کارانہ حق پژوہی کا شکار ہو گیا، وہاں نقصان مجھ سے کسی کو نہیں پہنچا۔ میرا مسلک میری تسلی کے لیئے کافی رہا۔

نہیں ملال گل باغ اگر نہیں ہوں میں

بہت ہے خار سر رہگزر نہیں ہوں میں

جب میں خود دوسروں کو راحت پہنچانے کی توفیق نہیں رکھتا ہوں

اپنے ہمجنسوں کی مجبوریاں اور معذوریاں بھی دیکھتا ہوں تو مجھے کسی سے شکوۂ بے مہری یا گلۂ بے اعتنائی کا کیا حق ہے۔

شکایت کس لئے بے مہریٔ ابنائے عالم کی
تجھے بھی اے دل آیا دیدۂ خونبار ہو جانا

صفائے قلب

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

یہ کہنا ضرور چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ زمانہ بگڑ جانے کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء سے چار سال تک والد آنجہانی اور ہم سب لوگ بریلی سول لائن میں سکونت پذیر رہے۔ میں اور مجھ سے بڑے بھائی ہم دونوں محلہ بزریہ موتی لال کے مکان میں سوموار سے سنیچروار تک مقیم رہا کرتے تھے کہ وہیں قریب کے ایک اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے منجھلے بھائی صاحب بھی اکثر ہماری دیکھ بھال کے لئے یہاں آتے تھے اور ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ صبح کا وقت ہے۔ منشی گوپال سرن امین مال تحصیل بریلی چار چپراسیوں کے ہمراہ پھاٹک میں داخل ہوتے ہیں۔ باہر صحن میں پلنگ پڑا ہے۔ اس پر منجھلے بھائی صاحب بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب:۔ تسلیم۔ تشریف رکھیے!

امین صاحب (بیٹھتے ہوئے):۔ تسلیم۔

...... کہیے کیسی تکلیف کی؟

...... رائے کنھیا لال پر سرکاری مالگزاری واجب ہے۔

.... وہ تو یہاں نہیں رہتے سول لائنز میں رہتے ہیں۔ یہاں یہ بچے تعلیم کی غرض سے رہا کرتے ہیں کیونکہ یہیں اسکول میں پڑھتے ہیں۔

.... مکان اور مال اسباب تو رائے صاحب ہی کا ہے۔

.... ہاں ہے۔

.... پردہ کرائیے میں قرقی کرونگا (ایک چپڑاسی سے مخاطب ہوکر) آواز دو پردہ کرلینا!

بھائی صاحب (کمر سے چاقو کھولتے ہوئے) کیا کہا کرے قرقی —! دیکھوں کس کی مجال ہے۔

امین صاحب مع چپڑاسیوں کے چپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے۔ تحصیل والوں نے کبھی ہم لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ امر واقعہ یہ تھا کہ امین صاحب ہمارے مخالفین کی سازش سے ہماری اہانت کے لئے تیار ہوکر آئے تھے۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد ایسا اتفاق ہُوا کہ میں ۱۹۱۹ء میں بہ حیثیت نائب تحصیلدار تحصیل نواب گنج ضلع بریلی میں تعینات ہوکر پہنچا۔ کچھ مہینے بعد ان امین صاحب کی تعیناتی بھی وہیں ہوئی بڑے بھائی صاحب نے خط لکھا کہ اب اسے سمجھ لینا۔ مگر میری طبیعت پر اس واقعہ کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ امین کا کام نائب تحصیلدار کی خاص نگرانی سے متعلق ہے۔ کئی معائنے میں نے منشی گوپال سرن کے کئے۔ نقص نکالنا تو دُور رہا اگر کوئی فروگذاشت نظر بھی آئی تو اس کی معقول توجیہ کر دی۔

نہیں مجھ کو تمیزِ دشمن و دوست — وفا کرنا ہے مصروف وفا ہوں

نیت میری جیسی ملازمت میں بدنیتی خوب پھلتی ہے۔ میں چاہتا تو کافی سرمایہ جمع کرلیتا۔ کم سے کم اتنا ضرور ہو جاتا کہ آخر عمر راحت و اطمینان سے گزر جاتی۔ بچوں کی تعلیم، پرورش، پرداخت بخوبی ہوسکتی۔ مگر جب ملازمت سے سبکدوش ہوکر نکلا تو بیک بینی و دو گوش۔ ہاتھ بھی خالی

جیب بھی خالی۔ ناجائز یافت تو بہت دُور ہے مجھے کسی کی دعوت قبول کرنے میں بہت تامل ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کے ٹکڑے کھانا ہوگا۔ اپنا سر نیچا کرنا ہوگا۔ اس احساس کا سرچشمہ کیا بتاؤں کیا تھا۔

دل نے ازل میں کہکے یہ ویرانہ لے لیا
کس سے اُٹھیں گے نازِ چمن میں بہار کے
اُٹھا سکے نہ ہم احسان شادمانی کے
جنوں کا پاس، غمِ دل کا احترام رہا

علایق دُنیا دنیا، کاروبار راحت و آسایش، سروسامان، عز و جاہ میں سے صرف ایک کشش نے مدت تک گرفتار رکھا۔ دولت و ثروت نے کبھی دل کو نہ کھینچا۔ عیش و طرب اجنبی سی چیزیں معلوم ہوئیں۔ کسی کی طرف بھی توجہ نہ ہوئی۔

ہم پر فریبِ رونقِ باطل چلے گا کیا
عالم کو جانتے ہیں غبار اس کی راہ میں

ہاں خاندانی وجاہت و وقار میں زمانے کے ہاتھوں جو انحطاط آ گیا تھا اسے واپس لانے کی بڑی آرزو رہی۔ اسی آرزو میں نائب تحصیلداری کو دیگر ملازمتوں پر ترجیح دی گئی تھی۔ یہاں کم سے کم ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر پہنچ جانے کی توقع غیر معمولی توقع نہ تھی۔ ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ بہت معزز و مقتدر متصوّر ہوتا ہے۔ میرے لئے بھی یہ خواب کتنا نشاط انگیز و ناز آفریں تھا لیکن خواب کی تعبیر کس طرح ہوئی۔ ٹھوکر پر ٹھوکر لگی۔ تمنّاؤں کا خون ہوتا گیا۔ طبیعت میں ہمواری پیدا ہوتی گئی۔ ہمواری میں سکون۔

حسرتیں مٹتی رہیں دل پے بہ پے ٹوٹا کیا ایک تہذیبِ مسلسل زندگی کا نام تھا

ڈپٹی کلکٹری تو دور تحصیلداری کے درجے تک پہنچنے کی کوشش بھی بار ور نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے کوشش کہتے ہیں میں نے کبھی اس کا حق ادا نہیں کیا۔ میری کوشش و تدبیر صرف ایک درخواست دیکر ختم ہو جاتی تھی۔ سفارشیں پہنچانا تو ایک طرف مجھے کسی حاکم سے التجا کرنے میں بھی حد درجہ تکلیف ہوتی تھی۔ پھر کامیابی کیونکر نصیب ہوتی۔ ہاں ہر ناکامی کے ساتھ طبیعت میں کچھ سکون کا پہلو نکلتا آتا تھا جیسے "چپ رہنے" ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے سوا ہمیں کچھ آتا ہی نہ ہو۔ نائب تحصیلداری کے تجربوں سے گھبرا کر کوشش کی کہ ملازمت صیغہ سب رجسٹراری میں منتقل ہو جائے۔ طبیعت کے خلاف بہت کچھ دوڑ دھوپ بھی کی مگر کچھ نہ ہوا۔ دشواریوں اور ناکامیوں سے موافقت کی سعی کرتے کرتے رفتہ رفتہ وہ دن آگیا کہ راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ رہا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قناعت پسند آدمی کو خصوصاً اسے جو راضی برضا ہونے کا دم بھرے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ ہاں ضرور نہیں ہو سکتی۔ مجھے بھی اور جتنی اس سے موافقت کی کوشش کی اور بڑھتی گئی۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ سب سے پہلے میری خود ساختہ روش اس کی ذمہ دار تھی :-

کیسا شکوہ کس کی شکایت ظلم یہ دل نے ڈھائے ہیں
خود ہی دنیا بھر کے ہم نے جی کو روگ لگائے ہیں

اس روش پر قائم نہ رہتا کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ زمانے کے ساتھ چلتا۔ آرام سے گزرتی۔ اس پر کچھ فطری غم آگئے۔

میری سرشت ہی میں ہیں رنج پسندیاں بھری
بڑھتا ہے خود بخود قدم دشت میں خار دیکھ کر

نکال لیتا ہے راحت میں رنج کے پہلو
تمہارے لطف سے بھی خوش نہیں دلِ غم کوش

تیسری کمزوری ایسی تھی جس پر کبھی قابو نہ پا سکا۔ ملازمت کی تلخیوں سے نجات پا جانے کے بعد جس چیز نے زندگی کو تلخ تر بنا دیا وہ یہی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ سہی اہل و عیال سے بے تعلق نہ ہو سکا۔ ان کی پرورش، پرداخت اور تعلیم کے باعث جو تکلیفیں رہیں سوہانِ روح تھیں۔

کچھ باطنی کیفیتیں یہ تھے وہ رنگ جو طبیعت میں ودیعت تھے۔ میں نے ان کی پرستش کی کیوں؟ اب کوئی اسے خبط کہے یا جنون ایسا معلوم ہوتا تھا میری زندگی انہیں سے ہے۔ رگ و پے میں یہی تھے، دل و دماغ میں یہی، روح میں یہی جیسے کوئی والہانہ طور پر کسی کی پرستش کرے۔ میں بھی ان کی پرستش میں بھولا رہا ورنہ جان بوجھ کر کون غم مول لیتا ہے کون گلزار حیات ویران کرتا ہے۔ یہ پرستش کیا تھی خود آرائی کا روگ جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا۔

ہائے کیوں تو نے نظر بھر کے اسے دیکھ لیا
لگ گیا روگ نیا دل کو خود آرائی کا

اپنی صورت دیکھ کر محو خود آرائی ہوں میں
دل میں داغِ عشق ہے اک آئینہ میرے لیے

اس خود آرائی میں عمر گنوانے سے زندگی کیا راس آتی۔ اسی تصویر کا دامن پاک رکھنے کے لیے طوفان سے لڑنا پڑا ہے۔ بڑے بڑے تھپیڑے سہے ہیں

نہ پوچھو زندگی کس طرح گزری میں ہر ہر سانس پر رو رو دیا ہوں

کش مکش حیات نے ہلکان کر دیا مار ڈالا۔ دو ایک بار بے اختیار

موت کی دُعا لب پر آئی مگر فوراً کسی نے چونکا دیا۔

عظمتِ زیست بھولتا ہے جگر   موت کا خواستگار ہوتا ہے

پھر وہی میں تھا اور میری روش۔

دل ہے سینے میں تو غم سے عہد و پیماں کیجئے
موت کے ارمان سے جینے کا ساماں کیجئے

اس موت کے معنی کلیتاً اجل نہ سمجھ لینا۔ ادھر بھی اشارہ ہے:-

بیخبر حیات تھا غم نے مجھے جگا دیا   زیست کا راز کھول کر موت کا آسرا دیا

یہ موت اور ہے۔ دونوں شعر بہت غور طلب ہیں۔

کیا کہوں کچھ غیر شعوری طور پر میرے اندر کہیں غم کی پیاس تھی۔

ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
ابھی اے شارتِ غم زندگی محسوس ہوتی ہے

مگر اس غم کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ اس کی وسعت لامحدود ہے۔ اسے آپ اپنا انعام کہا گیا ہے۔ دوسرا رخ غم کا اور ہے۔ اس سعی تسکین کی دوسری صورت ہے:-

کیوں ہے افسردہ اس قدر اے دل!
ہم بھی فانی ہیں غم بھی فانی ہے

میرے یہاں یاس شاید نہیں ہے۔

جو نامراد ہی تو یاس کا مقام نہیں   کہ زندگی دلِ ناداں یہیں تمام نہیں

طبیعت کی یہ افتاد تھی۔ دل کی دنیا بھی نرالی نکلی۔ ایک طرف یہ رنگ۔

دل جلوۂ جمال ہی پنہاں لئے ہوئے   ذرہ ہی آفتاب درخشاں لئے ہوئے

پردۂ عشق میں تھا جلوۂ حسن   یا میرے دل میں برق تھی مستور

دوسری طرف یہ شان

زمیں پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبینِ نیاز
نشانِ سجدہ غمِ دل کو ناگوار نہ ہو

نیاز میں بھی اِک انداز بے نیازی ہے
میری جبیں کو کوئی آستاں نہیں ملتا

تیسری طرف یہ حالت۔

کیسی دعا کہاں کا اثر کس کا مدعا! کچھ آگ کے سوا میری دل میں جگر نہیں

اس آگ کا ایک اثر یہ ہوا۔

بات کرتا ہے اگر کوئی تو رو دیتا ہے کچھ عجب حال ہوا ہے ترے سودائی کا

دوسرا یہ کہ اسی میں حسن جھلکنے لگا۔

اب میں سمجھا سینۂ سوزاں کے شق ہونے کا راز
آپ پنہاں کیا ہوئے گویا نمایاں ہو گئے

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بنکر
یونہیں غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

پھر یہ کیفیتیں بھی پیدا ہوئیں اور کئی کئی دن تک دل و دماغ بلکہ تمام ہستی پر کیف و سرور کا عالم طاری رہا ہے اور میں کھویا کھویا سا رہا ہوں۔

بالیدگیٔ روح ہے یا جلوۂ نگار پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لیے ہوئے

نہ جانے زخمِ دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی
پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

اپنی کہ اب میں انکی نظر پر نثار ہوں دل میں اتر گئے ہیں میری گلستاں کئی
نفس عنبر فشاں مسرور دل آنکھیں منور ہیں وہ یاد آیا کہ ہوتی ہے سحر صحنِ گلستاں میں

شب فراق تھی یہ غم کی محویت جیسے
وہ دلنواز جگرؔ ہم سے ہم کلام رہا

ان کیفیتوں میں ڈوب جانے کے بعد اگر کانوں میں یہ آوازیں آئیں تو میں خطاوار نہیں ہے۔

اپنے ہی سجدے کا ہے شوق میری سر نیاز میں
کعبۂ دل ہے سامنے محو ہوں میں نماز میں

ہاں عقل و خرد کی یہ باتیں نہیں۔ انسان کتنے ہی اپنے حدود بڑھالے بشریت کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا۔

حد آدمی کی مل کے خدائی سے رہ گئی
انساں سے بڑھ کے اور کچھ انسان نہ ہو سکا

آخر گھوم پھر کر پھر وہیں سکون ملا جہاں مل سکتا ہے۔

تیرے ہی سنگ در پہ مٹا و رہو بندگی
سر رکھ کے ہم نے دیکھ لئے آستاں کئی

۱۹۷۲ء میں جب نور نظر ناصر کو اجل آئی میرے دل و دماغ میں انقلاب عظیم آ گیا۔ تمام خیالات و معتقدات میں غیر معمولی تزلزل پیدا ہو گیا۔ تسلیم و رضا کا زعم بالکل باطل ثابت ہوا۔ میرے لئے دنیا ویران تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شعر و سخن خصوصاً غزل کا مشغلہ بخس معلوم ہونے لگا۔ کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی تھی۔

گر خدا ہی بھی تو معبود خدا کچھ بھی نہیں
غم ہی غم ہے دہر میں غم کے سوا کچھ بھی نہیں

پردے بہت رنگ کے ہوتے ہیں، ان میں سے شاید ایک پردہ یہ بھی تھا۔

غفلت کبھی، ملال کبھی، اور جنوں کبھی
ان کے میرے حجاب ہے درمیاں کئی

نہیں معلوم آج کل کونسا پردہ حائل ہے جس کے اندر یہ چند سطریں لکھی گئیں۔

دل سے باہر ہوں جگرؔ یا اختیار دل میں ہوں
اب نہیں معلوم مجھ کو کونسی منزل میں ہوں

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۹	پہلے	پہلی
۵	۱۲	بردار	نشین
۱۰	۹	سوانح	سوانح عمری
۱۲	۲۰	سوانح	سوانح عمری
۱۳	۱۴	رس جس سے	رس سے
۱۷	۷ سے ۱۳	تک سطریں مسترد سمجھی جائیں اُن کی جگہ یہ عبارت پڑھی جائے۔	
۲۰	۱۶	گلٹی	گلٹ
۷۹	۴	گلٹی	گلٹ
۲۲	۳ و ۴	صحت زبانِ اردو	صحت زبان
۲۲	۵	نیرنگ نظر	نیرنگ
۲۷	۴	ندل	دل
۳۰	۱۷	موضع	مواضع

صفحہ ۱۷، سطر ۷ سے ۱۳ کی جگہ پڑھی جانے والی عبارت:

معاشی پریشانیوں اور باطنی کشمکش نے صحت تباہ کردی ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو سب سے بڑے بیٹے کا ۱۹ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ کے فوراً بعد طویل رخصت لیکر وطن آئے۔ صحت پہلے ہی خراب تھی اور خراب ہوگئی یہاں تک کہ مجبوراً پنشن پر جانا پڑا۔ سات کم عمر بچوں کا بوجھ اور خانہ داری کی بھاری ذمہ داریاں سر پر، زندگی حزن وملال کی نہ ختم ہونے والی رات بن گئی۔ رنج اور

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۷	۱۲	آشنا ہونا	آشنا ہوجانا
۳۸	۱۲	کھروالوں	گھروالوں
۵۹	۱۹	گرانی	گرانی لے
۶۸	۱۵، ۱۶، ۱۷	چیڑاسی	چپراسی
		نیز صفحہ ۱۲۱ سطر ۱۴، ۱۲۲ سطر ۳، ۱۲۲ سطر ۔ پر بھی یہ تصحیح کر لی جائے	
۷۰	۱۳	اس قسم	غزل
۷۱	۱۸	شاعری کی وہ	شاعری کی دو
۷۲	۲۰	دل کو حرمائے	دل کو برمائے
۷۶	۱۴	قرض ودوام	قرض ووام
۷۷	۱۲	دوج ہے	دوج ہیں
۸۱	۲	جس کا	جن کا
۸۳	۱۸	رنج وغربت	رنج غربت
۸۸	۱۸	بقیہ صفحہ ۵۵	بقیہ صفحہ ۸۷
۹۹	فٹ نوٹ	پہلے کو پہلا اور دوسرے کو دوسرا سمجھا جائے	
۱۰۰	۱۷	محاسن ومصائب	محاسن ومعائب
۱۰۲	۱۵	اسی	اس
۱۱۰	۵	تفصیر	تقصیر
۱۱۴	۱۴	ہورہے گی	ہورہی گی
۱۲۲	۵	چاقو کھولتے ہوئے	چاقو نکال کر کھولتے ہوئے
۱۲۳	۱۱	طرف بھی	طرف کبھی
۱۲۸	۱۴	مشعل	مشغلہ